اِجارۂ بنوکیہ

بینک سے لیز اور کرایہ پر گاڑی وغیرہ لینے کا حکم
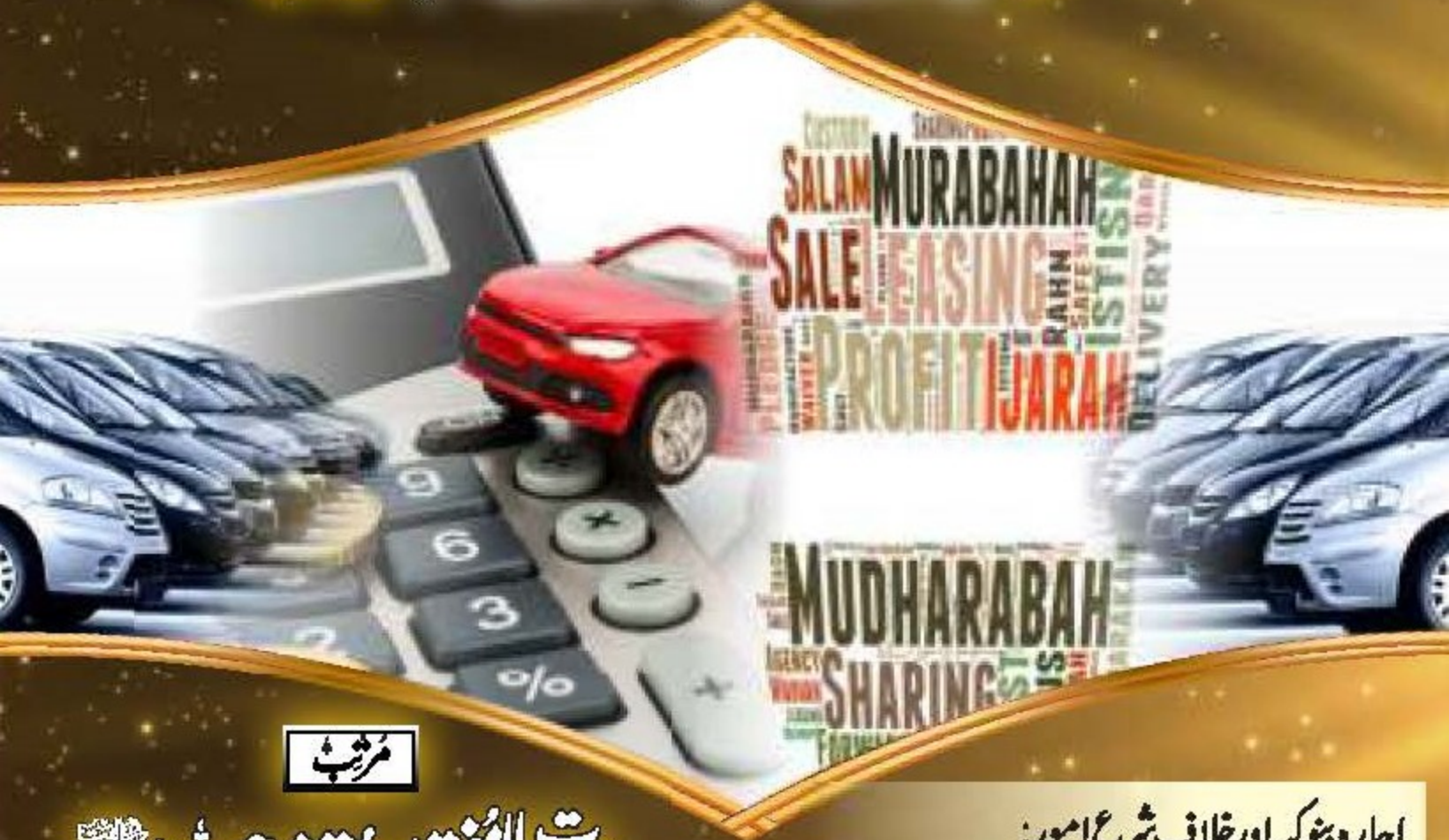
مُرتّب

حضرت مولانا مفتی احمد مُمتاز صاحب

تلمیذِ رشید

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی

خلیفۂ مجاز

عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب

اجارہ بنوکیہ اور خلافِ شرع امور:

سیکورٹی ڈپازٹ	مرمت کا خرچہ	بعض کرایہ کا مجہول ہونا
التزامِ تصدق	ایک عقد کو دوسرے عقد پر معلق اور مشروط کرنا	

مرابحہ بنوکیہ میں بھی چھ خلافِ شرع امور ہیں

ناشر تعمیر معاشرہ جامعہ خُلفائے راشدین

مدنی کالونی، ماگسی بے روڈ گریکس، ماڑی پور کراچی 0333-2117851

societyrectifier@gmail.com

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، اما بعد!

اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے، اور ایک خاص زندگی گزارنے کا مکلّف اور پابند بھی بنایا ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، اور حکیم ذات کے ہر فیصلے اور حکم میں بے شمار حکمتیں ہوتی ہیں، اس لیے ہر مومن کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو زندگی تجویز فرمائی ہے اس میں سراسر سو فیصد بندوں ہی کا نفع ہے۔ جس طرح عبادات وعقائد میں ہم شریعت کے احکام کے پابند ہیں، اسی طرح معاملات میں بھی ہم اصولِ شرعیہ کے پابند ہیں، کسی کے لیے جائز نہیں کہ خرید وفروخت اور کرایہ داری واجارہ کے معاملات میں اصولِ شرعیہ سے صرفِ نظر کرکے اپنے ذہن سے ان کی صورتیں تجویز کرے۔

اللہ تعالیٰ نے پورے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، اور پورے دین میں معاملات بھی ہیں۔ اس لیے کسی کے لیے ممکن نہیں کہ وہ معاملاتِ شرعیہ کو اپنی مرضی کے مطابق بدل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ایک تکوینی نظام ہے کہ دین میں غفلت، اضافہ، بگاڑ اور کوتاہیوں کو چلنے نہیں دیتے، ان کے ازالے کی صورتوں کو خود ہی وجود بخشتے ہیں۔

اسلام کے نام سے جو بینک منسوب ہیں ان کے کئی معاملات شرعی اصولوں کے خلاف ہیں، جن میں سے اجارہ اور مرابحہ بھی ہیں۔

زیرِ نظر رسالہ میں اسلامی بینکوں کے مروجہ اجارہ اور مرابحہ پر قدرے تفصیل سے کلام کیا گیا ہے، اور خلاف شرع امور کو عباراتِ فقہیہ صریحہ سے واضح کیا گیا ہے، نیز جن عبارات سے جواز پر استدلال کی کوشش کی گئی ہے ان کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ استدلال کس حد تک درست ہے؟ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں اور امت کے لیے نافع بنائیں۔

آمین یارب العالمین

﴿اجارہ بنوکیہ (گاڑی اجارہ) اور خلاف شرع امور﴾

اجارہ بنوکیہ کی صورت:

درج ذیل امور کی پابندی کے ساتھ بینک گاڑی وغیرہ اشیاء اجارہ اور کرایہ پر دیتا ہے:

(۱) مستاجر (کرایہ دار اور کلائنٹ) کو یہ بتایا جاتا ہے کہ جو گاڑی آپ کو مطلوب ہے اس کی کل قیمت مثلاً دس لاکھ ہے، اور اس کا تکافل مثلاً دو لاکھ ہے، اور اس پر مثلا تین لاکھ ہم زائد لیں گے، کل رقم پندرہ لاکھ ہوگی۔ ان میں سے مثلاً تین لاکھ ایڈوانس ......سیکورٹی ڈپازٹ...... کے نام پر جمع کرنا ہوگا اور باقی کرایہ کے نام پر ماہانہ اقساط کی صورت میں ادا کرنا ہوگا۔

(۲) اگر گاڑی جل گئی یا ایسا حادثہ پیش آیا جس سے پوری گاڑی تباہ ہوگئی تو بینک اس کا ضامن ہوگا اور تکافل کمپنی سے دوسری گاڑی لے کر دے گا۔

(۳) اگر گاڑی پوری تباہ نہ ہوئی، اس کے ٹائر خراب ہوگئے یا انجن کمزور ہوگیا یا پلگ وغیرہ دوسرے پرزے خراب ہوگئے تو ان کی مرمت آپ یعنی کرایہ دار اور کلائنٹ کے ذمہ ہوگی، اگر چہ وہ پرزے معمول کے استعمال سے خراب ہوئے ہوں، ان کے خراب ہونے میں کرایہ دار کی طرف سے کوئی تعدی، غفلت اور زیادتی نہ ہو۔

(۴) شروع کے چند مہینوں کا کرایہ تو متعین ہوگا کہ مثلاً بیس ہزار ہے لیکن اس کے بعد کا کرایہ ایک مخصوص شرح کے ساتھ منسلک ہوگا جس کے بڑھنے سے کرایہ بڑھے گا جیسے مثلاً ڈالر کی قیمت بڑھے گی تو کرایہ بھی بڑھے گا۔ البتہ یہ بڑھوتری پندرہ فیصد تک ہوگی، اس سے زیادہ نہیں، اور نہ بڑھنے سے نہ بڑھے گا، جبکہ اجارہ پوری مدت کے لیے ابتداء سے ہوگا

اور فسخ کا اختیار نہ ہوگا۔

(۵) کرایہ کی قسط میں تاخیر ہوئی تو مخصوص شرائط کے پیشِ نظر التزامِ تصدق کے نام سے مثلاً پانچ ہزار کرایہ سے زائد جمع کرنا ہوگا۔

(۶) اقساط کے مکمل ہونے کے بعد سابق وعدہ، شرط اور تعلیق کی بنیاد پر ایڈوانس...... سیکورٹی ڈپازٹ...... کے عوض گاڑی کی بیع ہوجائے گی، اور اس کے بعد آپ (کلائنٹ) گاڑی کے مالک ہوجائیں گے۔

اجارہ بنوکیہ اور خلافِ شرع امور:

اس میں پانچ خلافِ شرع امور ہیں:

(۱) سیکورٹی ڈپازٹ کے نام سے ایڈوانس رقم لینا۔ (سیکورٹی ڈپازٹ)

(۲) کرایہ دار اور مستاجر پر یہ شرط لگانا کہ گاڑی خراب ہوجائے تو اس کی مرمت کا خرچہ آپ کے ذمہ ہے۔ (مرمت کا خرچہ)

(۳) بعض مہینوں کے کرایہ اور اجرت کا مجہول ہونا۔ (بعض کرایہ کا مجہول ہونا)

(۴) تاخیر قسط و کرایہ کی صورت میں التزامِ تصدق کے نام سے مالی جرمانہ لگانا۔ (التزامِ تصدق)

(۵) الصفقۃ فی الصفقۃ یعنی اس شرط پر اجارہ اور کرایہ کا معاملہ کرنا کہ آخر میں بیع کا معاملہ بھی ہوگا۔ (ایک عقد کو دوسرے عقد پر معلق اور مشروط کرنا)

﴿خلافِ شرع امر نمبر ١: سیکورٹی ڈپازٹ کے نام سے ایڈوانس رقم لینا﴾

سیکورٹی ڈپازٹ کی فقہی تکییف اور حیثیت:

اس میں تین احتمال ہیں:

(١) رہن (٢) قرض (٣) امانت

اور یہ تینوں ناجائز ہیں۔

رہن کی تفصیل:

رہن دو وجہوں سے ناجائز ہے:

(١) رہن ہمیشہ کے لیے ''شےءِ مضمون''، یعنی ایسی شے جس کا ضمان لازم ہو...... کے بدلے میں رکھا جاتا ہے، جبکہ اجارہ میں شےءِ موجَر مثلاً گاڑی وغیرہ جو کہ کرایہ دار کے ہاتھ میں مضمون نہیں بلکہ امانت ہوتی ہے، جس کے عوض میں رہن رکھا جاتا ہے اور امانت کے عوض رہن رکھنے کو حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ناجائز فرمایا ہے۔

قال غياث الدين أبو محمد غانم بن محمد البغدادى الحنفى رحمه الله تعالىٰ: وكذا لو رهن المستأجر بالعين الذى استأجره أو أخذ المستأجر من الآجر رهنا بالعين الذى استأجره قبل التسليم كان باطلا .

(مجمع الضمانات ١٧٤، ط: دار الكتب العلميه)

قال ملک العلماء علاء الدين أبو بكر بن مسعود الكاسانى رحمه الله تعالىٰ: وأما العين فنقول: لا خلاف فى أنه لا يجوز الرهن بالعين التى هى أمانة فى يد الراهن كالوديعة والعارية ومال المضاربة والبضاعة والشركة والمستأجر ونحوها فإنها ليست بمضمونة أصلا.

(بدائع الصنائع ٥/٢٠٧، ط: رشيديه)

(۲) بنا بر تسلیمِ صحتِ رہن...... شیءمرہون...... سے نفع اٹھانا حرام ہے جبکہ یہاں اس رہن کی رقم کو بینک استعمال کر کے نفع اٹھاتا ہے۔

قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : قال ط: قلت: و الغالب من أحوال الناس أنهم انما یریدون عند الدفع الانتفاع و لولاه لما أعطاه الدرهم و هذا بمنزلة الشرط لأن المعروف کالمشروط و هو مما یعین المنع و الله تعالیٰ أعلم. (الشامیة ۱۰/۸۷،ط:رشیدیه)

قرض کی تفصیل:

قرض بھی تین وجہ سے ناجائز ہے:

(۱) اس قرض میں تاجیل اور مدت کی شرط ہوتی ہے کہ اتنی مدت تک آپ کا یہ قرض ہمارے پاس لازماً رہے گا، آپ واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے ۔ جبکہ قرض میں یہ شرط جائز نہیں، کیونکہ یہ شرط قرض کو سود بنا دیتی ہے۔

قال الامام المرغینانی رحمه الله تعالیٰ: (و کل دین حال اذا أجله صاحبه صار مؤجلا) لما ذکرنا (الا القرض) فان تأجیله لا یصح لأنه اعارة و صلة فی الابتداء حتی یصح بلفظة الاعارة و لا یملکه من لا یملک التبرع کالوصی و الصبی و معاوضة فی الانتهاء فعلی اعتبار الابتداء لا یلزم تأجیل فیه کما فی الاعارة اذ لا جبر فی التبرع و علی اعتبار الانتهاء لا یصح لأنه یصیر بیع الدراهم بالدراهم نسیئة و هو ربا.(الهدایة ۳/۷۶)

(۲) یہ قرض عقد اجارہ کے لئے شرط ہے اور عقد میں ایسی شرط جو عقد کے مقتضاء اور طلب کے خلاف ہو اور اس میں کسی ایک فریق کا فائدہ ہو، اس کو شرعاً ’’شرطِ فاسد‘‘ کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے عقد فاسد اور ناجائز ہو جاتا ہے۔لہٰذا بینک کے اس شرط لگانے سے اجارہ اور کرایہ کا یہ معاملہ فاسد اور ناجائز ہوا۔

فی الھندیة: و لو استاجر دارا بأجرة معلومة و شرط الآجرتطیین الدار و تعلیق باب علیها أو ادخال جذع فی سقفها علی المستأجر فالاجارة فاسدة و کذا اذا آجر ارضا و شرط کری نهرها أو حفر بئرها أو ضرب مسناة علیها کذا فی البدائع. (الھندیة ۴/۴۴۳، ط: رشیدیه)

(۳) اس میں سود کا گناہ ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ (بفرض تسلیم عدم شرط) یہ قرض...... حدیث: ﴿کل قرض جر منفعة فهو ربا﴾ میں داخل، ناجائز اور سود ہے کیونکہ اس کی وجہ سے عام طور پر مستاجر اور کلائنٹ دو فائدے حاصل کرتا ہے:

ایک فائدہ...... استیجار کا یعنی اس کی بنیاد پر کرایہ پر گاڑی مل جاتی ہے...... اور یہ سود ہے۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بلٹی کے مسئلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’اگر قرض لئے بغیر ٹرک کا ڈرائیور کسی کو وکیل نہیں بناتا تو یہ اس لئے ناجائز ہے کہ وکیل قرض سے استیجار کا نفع حاصل کر رہا ہے جو سود ہے‘‘۔ (احسن الفتاوی ۱۷۵، ۱۷۶/ ۷)

دوسرا فائدہ ...... جب ایڈوانس قرض زیادہ ہو تو کرایہ میں کمی کی صورت میں بھی فائدہ حاصل کرتا ہے۔ مثلاً بدوں ایڈوانس اور قرض اگر کرایہ دس ہزار ہے تو ایڈوانس کی صورت میں پانچ یا آٹھ ہزار ہو جاتا ہے............ اور اس فائدہ کو خود حضرات مجوزین نے کتاب ’’غیر سودی بینکاری‘‘ میں بھی ناجائز لکھا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

’’ان میں سے بعض طریقوں پر فقہی اعتبار سے اشکال بھی ہے مثلاً اس سیکیورٹی ڈپازٹ کی وجہ سے، جو خلط کی وجہ سے انتہاءً قرض بن چکا ہے کرائے میں اجرت مثل سے کمی کرنا جائز نہیں‘‘ (غیر سودی بینکاری: ۲۷۴)

احتمال قرض پر مندرجہ بالا اشکالات کا کوئی صحیح حل ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ ایڈوانس رقم رکھوانا ناجائز ہے اور عقدِ اجارہ فاسد، ناجائز اور بحکمِ سود ہے۔

اور امانت دو وجہوں سے درست نہیں ہے:

امانت کی تفصیل:

امانت دو وجہ سے صحیح نہیں:

(۱) اس پر امانت کی تعریف صادق نہیں۔ کیونکہ امانت کو "سیکوریٹی ڈیپازٹ" اور "لازمی قرضہ" نہیں کہا جاتا۔ بلکہ امانت کی تعریف یہ ہے کہ "صراحۃً یا دلالۃً کسی غیر کو اپنے مال کی حفاظت پر مقرر کرنا"۔

تسليط الغير على حفظ ماله صريحا أو دلالة.

(الشامية ۸/۵۲۶، ط: رشيديه)

(۲) امانت کا حکم بھی ثابت نہیں۔ کیونکہ امانت کا حکم یہ ہے کہ امانت رکھنے والا جب چاہے لے سکتا ہے، امین کے ذمہ ہے کہ عندالطلب ادا کرے، امین کو روکنے کا حق نہیں، جبکہ یہاں روکا جاتا ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: (و هي امانة) و هذا حكمها مع وجوب الحفظ و الأداء عند الطلب و استحباب قبولها.

(الشامية ۸/۵۲۸، ط: رشيديه)

کتاب "غیر سودی بینکاری" پر تبصرہ:

(۱) حضرت نے اسے انتہاءً قرض تسلیم کرکے اجرت مثل سے کمی کو ناجائز فرمایا ہے۔

آیئے اس ناجائز ہونے کی فقہی وجہ پر غور کرتے ہیں، جہاں تک ہم نے غور کیا ہے تو ہماری سمجھ میں عدم جواز کی وجہ ﴿**كل قرض جر منفعة فهو ربا**﴾ ہے یعنی یہ سود ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ آپ مدظلہ نے "ناجائز تو لکھ دیا" لیکن "سود" نہیں فرمایا، کیوں؟

اگر ﴿**كل قرض جر منفعة فهو ربا**﴾ کی وجہ سے اجرت مثل میں کمی کرنے کا نفع

حاصل کرنا، ناجائز ہے تو اس کی وجہ سے استیجار کا نفع حاصل کرنا کیوں ناجائز نہیں؟ جبکہ یہ معلوم ہے کہ سیکوریٹی ڈیپازٹ کے بغیر استیجار کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد قدس سرہ نے تو بلٹی کے مسئلہ میں استیجار کے فائدہ کو بھی ﴿کل قرض جر منفعة فهو ربا﴾ میں داخل کر کے اس کو سود اور ناجائز فرمایا ہے۔

(احسن الفتاوی ۱۷۵،۱۷۶/۷)

حدیث شریف میں تو مقروض سے ہدیہ قبول کرنے اور عاریۃً اس کے جانور کو سواری کے لئے لینے کو بھی سود فرما کر منع کیا گیا ہے۔

عن أبی بردة بن أبی موسی فقال قدمت المدینة فلقیت عبد الله بن سلام فقال : انک بأرض فیها الربوا فاش فاذا کان لک علی رجل حق فأهدی الیک حمل تبن أو حمل شعیر أو حبل قت فلا تأخذه فانه ربوا، رواه البخاری. (المشکوة: ۲۵۲)

’’حضرت ابو بردہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب میں مدینہ میں آیا اور حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے ملا تو انہوں نے فرمایا کہ تم ایک ایسی سرزمین میں رہتے ہو جہاں سود کا بہت رواج ہے، لہٰذا اگر کسی پر تمہارا حق ہو یعنی کوئی تمہارا قرضدار ہو اور وہ تمہیں بھوسے کا ایک گٹھڑا، یا جو کی ایک گٹھڑی، یا گھاس کا ایک گٹھا بھی تحفے کے طور پر دے تو تم اسے قبول نہ کرنا کیونکہ وہ سود کا حکم رکھتا ہے۔‘‘

و عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اذا أقرض الرجل الرجل فلا یأخذ هدیة ، رواه البخاری فی تاریخه . (المشکوة: ۲۵۲)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی کو قرض دے تو وہ اپنے قرضدار سے بطور تحفہ بھی کوئی چیز قبول نہ کرے۔‘‘

و عن أنس رضی اللہ عنہ قال : قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : اذا أقرض أحدکم قرضا

فأهدى اليه أو حمله على الدابة فلا يركبه و لا يقبلها الا أن يكون جرى بينه و بينه قبل ذلك ، رواه ابن ماجه و البيهقى فى شعب الايمان.

(المشكوة: ۲۵۲)

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص کسی کو قرض دے اور پھر قرض لینے والا اس قرض دینے والے کے پاس کوئی تحفہ بھیجے یا سواری کے لئے کوئی جانور دے تو وہ قرض دینے والا نہ اس جانور پر سوار ہو اور نہ اس کا تحفہ قبول کرے، ہاں اگر قرض دینے والے اور قرض لینے والے دونوں کے درمیان پہلے سے تحفہ یا سواری کے جانور کا لینا دینا جاری ہو تو پھر اس کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ تو مقروض کی دیوار کے سایہ سے نفع حاصل کرنے سے بھی احتراز فرماتے تھے۔

مرقات میں حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

و لقد بالغ امام المتورعين فى زمنه أبو حنيفة رحمه الله تعالىٰ حيث جاء الى دار مدينه ليتقاضاه دينه، و كان وقت شدة الحر، و لجدار تلك الدار ظل، فوقف فى الشمس الى أن خرج المدين بعد أن طال الابطاء فى الخروج اليه، و هو واقف فى الشمس صابر على حرها غير مرتفق بذلك الظل، لئلا يكون له رفق من جهة مدينه، و فيه أن مذهب ذلك الامام أن قبول رفق المدين حرام كالربا. (باب الربا، الفصل الثالث، المرقاة ٦/٦٨)

امام المتقین والمجتہدین ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے زمانے میں بہت احتیاط کرتے تھے، ایک بار وہ اپنے قرض دار کے گھر قرض وصول کرنے کے لئے آئے سخت گرمی کا زمانہ تھا اس شخص کے گھر کی دیوار کا سایہ تھا لیکن امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دھوپ میں ہی کھڑے رہے جب تک کہ وہ قرض دار گھر سے واپس نہ آیا حالانکہ اس کے باہر آنے میں بہت دیر بھی لگی اور امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ دھوپ ہی میں کھڑے گرمی برداشت کرتے

رہے لیکن اس سایہ سے نفع نہیں اٹھایا کہ کہیں قرض دار کی جانب سے نفع کی کوئی صورت نہ بن جائے، اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ امام صاحب کے مذہب کے مطابق قرض دار سے نفع قبول کرنا بھی سود ہی کی طرح حرام ہے۔

(۲) ﴿کل قرض جر منفعة فهو ربا﴾ کے خلاف اگر تعامل ہوجائے تو یہ سود جائز اور حلال ہوجائے گا؟......مجوزین حضرات سے دو باتوں کی وضاحت مطلوب ہے:

ایک یہ کہ یہ بازاری تعامل جس کا حوالہ دیا گیا ہے، کیا یہ جائز ہے؟......یعنی مکانات کرایہ پر دینے کی صورت میں دو قسم کا سیکوریٹی ڈیپازٹ لیا جاتا ہے، بعض کی وجہ سے کرایہ کم ہوجاتا ہے، اور بعض کی وجہ سے کرایہ تو کم نہیں ہوتا، البتہ اس کی بنیاد پر کرایہ پر مکان مل جاتا ہے، کیا یہ سب صورتیں جائز ہیں؟

دوسرے یہ کہ اس تعامل سے ﴿کل قرض جر منفعة فهو ربا﴾ کے کلیہ کے خلاف سود کی بعض صورتیں جائز ہوجائیں گی؟ جبکہ کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں فتاوی محمودیہ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے:

''دوسرے یہ کہ ابتلاء عام حرام کو حلال کرنے میں مؤثر نہیں''۔

(غیر سودی بینکاری، ص: ۲۰۸، ۲۵۵)

(۳) اسٹیٹ بینک کے ہاں جمع کرنے کی بات بھی دو وجہ سے مخدوش ہے:

پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ عادۃً ممکن ہی نہیں کیونکہ اسٹیٹ بینک میں جمع کرائی جانے والی رقم کی مقدار، وقت اور تاریخیں یقیناً الگ ہوں گی جبکہ سیکوریٹی ڈیپازٹ روزانہ دن میں درجنوں افراد کی طرف سے جمع ہوتا رہتا ہے اور بینک کا یہ انتظام کرنا کہ روزانہ کا سیکوریٹی ڈیپازٹ علیحدہ کسی تجوری میں جمع کرتے رہیں اور اسٹیٹ بینک کے مطالبہ کے وقت پھر وہی رقم اٹھا کر حوالہ کردیں یہ عادۃً ایک کہانی تو ہوسکتی ہے لیکن اس کے مطابق عمل ہو، یہ

قابلِ تسلیم نہیں ورنہ اس کا تحریری اور عملی ثبوت پیش کر دیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بنابر تسلیم پوچھنا یہ ہے کہ بینک نے اس قرض سے نفع اٹھایا یا نہیں؟ اسٹیٹ بینک کے مطالبہ سے چھٹکارا حاصل ہوا یا نہیں؟ .... رہی یہ بات کہ یہ نفع فرصت ضائعہ کی تلافی کی صورت میں ہے اور نقود میں اس کا اعتبار نہیں یہ ایسی بات ہے کہ دلیل نہ دارد۔ بلکہ خلاف دلیل ہے کیونکہ ''یدا بید'' اور ''النقد خیر من النسیئة'' اس تاویل کو رد کرتے ہیں۔

دیکھیے! حدیث شریف **الذھب بالذھب و الفضة بالفضة** (الحدیث) کے آخر میں **یدا بید** کے الفاظ بھی ہیں جو صراحۃً اس پر دال ہیں کہ اگر چہ مثلاً دو افراد نے باہم بیع صرف کا معاملہ کیا ایک نے دس دینار سونا نقد اور دوسرے نے دس دن بعد دیا، تو یہ بھی **والفضل ربا** میں داخل اور سود ہے، حالانکہ یہاں تاخیر کی وجہ سے مقدار میں کچھ اضافہ نہیں ہوا، پھر بھی اس کو فضل فرما کر سود کہا گیا ہے...... معلوم ہوا کہ نقد اور ادھار میں کیفیت کے اعتبار سے فرق ہے۔ چونکہ نقد، ادھار کی بنسبت خیر اور بہتر ہے، تو گویا تاخیر سے دینے والے نے اضافی چیز حاصل کی ہے اور وہ نقد کی اچھائی اور خیر ہے، جو اس کو فوراً اور ہاتھ در ہاتھ مل گئی جبکہ پہلے شخص کو نقد کی خیریت سے محروم ہونا پڑا۔ اسی سے حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے یہ قاعدہ مستنبط فرمایا ہے کہ ''**النقد خیر من النسیئة**''۔

ہاں! اگر مقصد یہ ہو کہ ضمان نہیں آتا تو اور بات ہے، لیکن گناہ تو بہر حال ہوگا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ہر لحاظ سے اس کا اعتبار نہیں، درست نہیں۔

(۴) فرماتے ہیں:

''اور حنفیہ کا اصول یہ ہے کہ جو شرط مخالف مقتضائے عقد ہو، عرف اور تعامل کی وجہ

سے وہ جائز ہو جاتی ہے" الخ۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۲۷۲)

تعجب ہے کہ کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں اس بدوں عوض زیادتی کی شرط کو ان شرطوں کی طرح قرار دے کر اس کو جائز فرما دیا ہے جو تعامل کی وجہ سے مفضیہ الی النزاع نہیں رہتیں ......یا......عقد کا جزء بن جاتی ہیں، اس لئے وہ تعامل کی وجہ سے جائز اور غیر مفسد قرار دی جاتی ہیں، جبکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

جو شرط جہالت اور نزاع کے سبب فاسد ہوتی ہے وہ عرف اور تعامل سے جائز ہو جاتی ہے، کیونکہ عرف اور تعامل کے بعد اب اس میں جہالت اور نزاع کا عنصر باقی نہیں رہتا، اسی طرح ''صفقۃ فی صفقۃ'' یعنی ایک عقد کو دوسرے عقد پر معلق اور مشروط کرنے کی صورت میں اگر عرف اور تعامل کی وجہ سے ایک عقد دوسرے عقد کا جزء بن جائے اور اس کے عوض میں ثمن اور اجرت کا کچھ حصہ بھی آجائے تو یہ بھی عقدِ واحد کے حکم میں ہو کر جائز ہو جاتا ہے، اور جہاں پر شرط ایسی ہو جس کا تعلق نہ تو جہالت و نزاع سے ہو اور نہ معقود علیہ کا جزء بن سکے، وہ عرف اور تعامل سے جائز نہیں ہوتی۔ بلکہ عرف اور تعامل کے باوجود بھی فاسد اور ناجائز ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے عقد کا معاملہ بھی فاسد اور ناجائز ہوتا ہے۔...... بینک کی شرطِ مذکور یعنی ایڈوانس رقم لے کر اجارہ کا معاملہ کرنا ان شروط میں سے ہے جو تعامل اور عرف سے بھی جائز نہیں، اس لیے بینک کا یہ معاملہ اس شرطِ فاسد کی وجہ سے فاسد اور ناجائز ہے۔

''رہن سے نفع اٹھانے کی شرط''......اور......''پگڑی سسٹم کا عرف و تعامل''......سب کو معلوم ہے، پھر بھی اس عرف و تعامل کی وجہ سے شےءِ مرہون سے نفع اٹھانے اور پگڑی کی وجہ سے کرایہ میں اجرتِ مثل سے کمی کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا۔ ہاں! عدم جواز کہنے والوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔ نیز کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں بھی اس کو

ناجائز لکھا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

''ان میں سے بعض طریقوں پر فقہی اعتبار سے اشکال بھی ہے مثلاً اس سیکیورٹی ڈپازٹ کی وجہ سے، جو خلط کی وجہ سے انتہاءً قرض بن چکا ہے کرائے میں اجرت مثل سے کمی کرنا جائز نہیں'' (غیر سودی بینکاری، ص:۲۷۴)

تنبیہ نمبر۱: شرائط کی مدلل تفصیل صرف علمائے کرام کی تشفی اور اطمینان کے لیے پیش خدمت ہے:

﴿مفسدِ عقد شرائط کی ضروری تفصیل﴾

وہ شرائط جو مقتضائے عقد کے خلاف اور مفسدِ عقد بیع و اجارہ ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں:

قسمِ اول: وہ شرائط جو مستلزمِ ربا ہیں یعنی ان شرائط کی وجہ سے احد الفریقین کو خالی عن العوض نفع اور زیادتی حاصل ہو۔

قسمِ ثانی: وہ شرائط جو مستلزم ِربا نہیں بلکہ جہالت، نزاع اور ضرر وغیرہ کو مستلزم ہیں۔

قسمِ اول (جو شرائط مستلزم ربا ہوں) کی اقسام: قسمِ اول کی پھر دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ بیک وقت دو عقد اور دو معاملے کیے جائیں اور ان میں سے ایک ......دوسرے پر معلق اور مشروط ہو جس کو حدیث میں ''صفقة فی صفقة'' فرمایا گیا ہے۔ جیسے کسی نے مکان بیچا اور شرط لگائی کہ ایک مہینہ میں اسی میں رہوں گا بالاجرۃ یا بدون الاجرۃ۔

دوسری قسم یہ ہے کہ معاملہ اور عقد ایک ہو اور شرط کی وجہ سے احد الفریقین کو زیادتی خالی عن العوض حاصل ہو، جیسے کسی نے کوئی چیز اس شرط پر بیچی کہ مشتری مجھے اتنا قرض یا ہدیہ بھی دے گا۔

پہلی قسم (ایک معاملہ دوسرے کے ساتھ معلق و مشروط ہو) کی پھر دو صورتیں ہیں:

(۱) ایک معاملے کو دوسرے معاملے کا جزء اور حصہ بنانا ممکن ہو جیسے کپڑا خریدا اور

ساتھ سلائی کی شرط لگائی کہ سلائی کر کے دو گے یا رنگنے کے لیے کپڑا دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ رنگ بھی تمہارا ہو گا۔ ان دونوں مثالوں میں دو عقد اور معاملے جمع ہیں، ایک بیع ہے اور ایک اجارہ۔

پہلی مثال میں اصل عقد بیع ہے جو معلق اور مشروط ہے اجارہ پر اور دوسری مثال میں اصل عقد اجارہ ہے جو کہ معلق اور مشروط ہے بیع پر......لیکن یہاں یہ ممکن ہے کہ ایک عقد دوسرے کا جزء، حصہ اور تابع بنے۔

(۲) ایک عقد......دوسرے عقد کا جزء، حصہ اور تابع بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا جیسے کسی پر مکان یا غلام بیچ کر بائع نے یہ شرط لگا دی کہ مکان میں ایک مہینہ میں رہوں گا یا غلام سے ایک مہینہ میں خدمت لوں گا۔ اس مثال میں بھی دو عقد جمع ہیں ایک بیع ہے اور ایک اجارہ ہے اور عقد بیع مشروط و معلق ہے عقد اجارہ پر لیکن یہاں یہ ممکن نہیں کہ دوسرا عقد پہلے عقد کا جزء، حصہ اور تابع بنے کیونکہ عقدِ بیع میں جو بائع یعنی عین کا بیچنے والا ہے......اجارہ میں وہ مستاجر اور منافع کے لیے مشتری و خریدار ہے اور بیع میں جو مشتری یعنی عین کا خریدار ہے وہ منافع میں عین کا خریدار نہیں بلکہ مُوجر اور بیچنے والا ہے۔ اس لیے اس عقدِ اجارہ کو نہ ثمن کے ساتھ ملا سکتے ہیں نہ مبیع کے ساتھ۔

پہلی قسم (ایک معاملہ دوسرے کے ساتھ معلق و مشروط ہو) کی دو صورتوں کے احکام:

پہلی صورت (ایک معاملہ کو دوسرے معاملے کا جزء اور حصہ بنانا ممکن ہو) **کا حکم:** جہاں ایک عقد کو دوسرے عقد کا جزء بنانا ممکن ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس طرح کے دو عقدوں کا عرف اور تعامل ہو جائے تو عرف کی وجہ سے ایک عقد کا معقود علیہ......دوسرے عقد کے معقود علیہ کا جزء اور حصہ بن کر دونوں کا معقود علیہ ایک ہو جائے گا اور ثمن......معقود علیہ کے

تمام حصص اور اجزاء کے عوض میں ہوجائے گا۔لہٰذا کوئی جزء اور حصہ خالی عن العوض نہ ہوگا اور یہ معاملہ جائز ہوجائے گا۔

مثالِ اول......میں عقدِ اجارہ کی منفعت بمنزلہ عین کے قرار دے کر مبیع اور معقود علیہ کا جزء اور حصہ بن جائے گا اور ثمن چونکہ کل مبیع اور معقود علیہ کے مقابلے میں ہے اور یہ سلائی بھی کل مبیع اور معقود علیہ کا ایک جزء بنا، لہٰذا ثمن کا ایک جزء اس کے مقابلے میں بھی آیا اور عقدِ اجارہ کی شرط خالی عن العوض نہیں رہی اور وہ مفسدہ وخرابی جس کو یہ شرط مستلزم تھی، اب نہ رہی ......اور......مثالِ ثانی...... میں رنگ منافع کے تابع اور اس کا ایک حصہ اور جزء بن جائے گا اور اجرت اس پوری منفعت کے عوض میں ہوگی۔ چونکہ رنگ بھی اس منفعت کا ایک جزء ہے لہٰذا اجرت کا ایک حصہ اس کے مقابلے میں بھی ہوگا اور اس طرح عقد بیع کی یہ شرط بھی خالی عن العوض نہیں رہے گی۔

قال العلامة القدوری رحمه الله تعالیٰ :قال ابو حنیفة رحمه الله تعالیٰ: اذا اشتری فلعة بدرهم علی ان یحذوها البائع ، جاز البیع وقال الشافعی رحمه الله تعالیٰ : لایجوز. لنا:ان الناس یفعلون ذلک فی سائر الاعصار من غیر نکیر. ولانه عقد یشتمل علی بیع واجارة جرت العادة بالتعامل فیه فصار کصبغ الثوب ، ولان العین والعمل کل واحد منهما یجوز العقد علیه علی الانفراد ، فاذا جاز ان یجتمعا فی العقد تبع ، وهو العقد علی الصبغ ، جاز ان یجتمعا فی العقد ، والعمل تبع له........... ولان احد العقدین ههنا تابع فیفارق الحکم المشروط صریحا بدلالة: الصباغ لوابتاع منه الصبغ واستاجره علی العمل جاز وان کان البیع بیعا مع عقد الاجارة فجاز لتعامل الناس به.

(التجرید ۵/۴ ۲۷۱، ۲۷۱۵،ط:محمودیه)

قال العلامة الحصکفی رحمه الله تعالیٰ :(او لا یقتضیه لکن) یلائمه

کشرط رهن معلوم و کفیل حاضر. ابن ملک. او (جری العرف به کبیع نعل علی ان یحذوه) البائع (ویشرکه) ای یضع علیه الشراک وهو السیر ومثله تسمیر القَبْقَاب (استحسانا للتعامل بلا نکیر).

وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : (قوله : استحسانا للتعامل) أی یصح البیع ویلزم الشرط استحسانا للتعامل. والقیاس فساده؛ لأن فیه نفعا لأحدهما وصار کصبغ الثوب ، مقتضی القیاس منعه ؛ لأنه إجارة عقدت علی استهلاک عین الصبغ مع المنفعة ولکن جوز للتعامل ومثله إجارة الظئر، وللتعامل جوزنا الاستصناع مع أنه بیع المعدوم ومن أنواعه شراء الصوف المنسوج علی أن یجعله البائع قلنسوة أو قلنسوة بشرط أن یجعل البائع لها بطانة من عنده وتمامه فی الفتح.

وفی البزازیة : اشتری ثوبا أو خفا خلقا علی أن یرقعه البائع ویسلمه صح اهـ. ومثله فی الخانیة. قال فی النهر : بخلاف خیاطة الثوب لعدم التعارف اهـ. قال فی المنح : فإن قلت : ((نهی ﷺ عن بیع وشرط)) فیلزم أن یکون العرف قاضیا علی الحدیث. قلت : لیس بقاض علیه بل علی القیاس ؛ لأن الحدیث معلول بوقوع النزاع المخرج للعقد عن المقصود به وهو قطع المنازعة والعرف ینفی النزاع فکان موافقا لمعنی الحدیث فلم یبق من الموانع إلا القیاس. والعرف قاض علیه اهـ. ملخصا. قلت : وتدل عبارة البزازیة والخانیة وکذا مسألة القبقاب علی اعتبار العرف الحادث ومقتضی هذا أنه لو حدث عرف فی شرط غیر الشرط فی النعل والثوب والقبقاب أن یکون معتبرا إذا لم یؤد إلی المنازعة.

(الشامیة ۷/۲۸۸،ط:رشیدیه)

قال العلامة خالد الاتاسی رحمه الله تعالیٰ : (البیع بشرط متعارف یعنی الشرط المرعی فی عرف البلدة صحیح والشرط معتبر) .... ومن

هـنـا يـعلم حكم ما تعورف فى بلدتنا حمص وهو ان احد الفلاحين من جميع القـرى يـاتـى بـآلة حراثته الحديدية المسماة عندهم بالسكه لعند الحداد ، فيشتـرى مـنه رطل حديد مثلاً بضعفى قيمته على ان يحميه فى النارو يمزجه فـى سـكتـه التى اتى بها ، وهذا الشرط قد تعارفه الفلاحون جميعهم مع اهل تـلـك الـصـنـعة حتـى صار بينهم عرفا مستفيضا فمقتضى هذه المادة مع ما حققه هذا الفاضل ان يكون بيع الحديد صحيحا والشرط معتبرا.

(شرح المجلة للاتاسى ۲/۶۴،۶۵،رقم المادة:۱۸۸،ط:رشيديه)

قـال الـعـلامة الـزيـلـعـى رحـمه الله تعالى : وأجيزت فى الظئر والصبغ لكونها آلة للعمل بيعا وضمنا وكم من شيء يجوز ضمنا وإن لم يجز قصدا .

(تبيين الحقائق ۴/۴۸،ط:امداديه)

قال العلامة الزيلعى رحمه الله تعالىٰ : والعين قد تدخل تبعا للمنفعة كما اذا استـاجـر صباغا ليصبغ له الثوب فانه يجوز ويدخل الصبغ فيه تبعا والعقد وارد على المنفعة وهو فعل الصباغة لا على استهلاك العين .

(تبيين الحقائق ۴/۱۲۳،ط:سعيد)

قـال مـلـك الـعـلـمـاء الكاسانى رحمه الله تعالىٰ : واللبن يدخل فيه تبعا كالصبغ فى استئجار الصباغ.(بدائع الصنائع ۴/۱۷،ط:رشيديه)

قـال الـعلامة الشلبى رحمه الله تعالىٰ : (قوله : وفى العرف يتناول البناء) قال الاتقانى: وذلك لان اسم الدار فى العرف يتناول البناء والعرصة جميعا فيـدخل كالعرصة والمطلق من الالفاظ ينصرف الى المتفاهم فى العرف ولا يفهم فى العرف من بيع الدار بيع عرصتها لابناؤها بل بيعهما جميعا.

(تبيين الحقائق مع حاشية الشلبى ۴/۲۹۰،ط:سعيد)

قال العلامة خالد الاتاسى رحمه الله تعالىٰ :(المعروف عرفا كالمشروط

شـرطـا) ای الـمـعـروف المعتاد بين الناس وان لم يذكر صريحا فهو بمنزلة الـصـريـح لـدلالة الـعـرف عـلـيـه............ والحـاصل ان المعروف عـرفـا كـالـمشـروط ذكـرا عـنـد عدم التصريح بخلافه والا فالعبرة لما صرح به لا للعرف.(شرح المجلة للاتاسی، ۱/۱۰۰، ۱۰۱، رقم المادة: ۴۳، ط:رشيديه)

دوسری صورت (ایک معاملہ کو دوسرے معاملے کا جزء اور حصہ بنانا ممکن نہ ہو) کا حکم:

جہاں ایک عقد کو دوسرے عقد کا جزء بنانا ممکن نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی تمام صورتیں ناجائز، مُفسدِ عقد اور ربا میں داخل ہیں، کیونکہ شرط کو مشروط کے تابع اور اس کا حصہ بنانا ممکن نہیں جیسے مثالِ مذکورہ بالا (کسی پر مکان یا غلام بیچ کر بائع نے یہ شرط لگا دی کہ مکان میں ایک مہینہ میں رہوں گا یا غلام سے ایک مہینہ میں خدمت لوں گا) میں بائع نے مکان میں ایک مہینہ رہنے یا غلام سے ایک مہینہ خدمت کی شرط لگائی تھی تو یہاں پر بائع کی مکان میں رہائش اور غلام سے خدمت لینے کو مبیع کا جزء بنانا ممکن اور درست نہیں، نہ ہی ثمن کو اجرت کا جزء بنانا ممکن ہے، کیونکہ یہاں اجارہ میں منفعت جو مبیع کے مشابہ اور مناسب ہے، اس کا مالک مشتری ہے نہ کہ بائع، اور مشتری کے لیے منافع کو ثمن کا جزء بنانا بھی درست نہیں کیونکہ منافع مبیع کے مشابہ اور مناسب ہیں، ثمن کے مشابہ نہیں۔

وقـال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالى : وكذلك لو باع عبدا على ان يستـخـدمـه البـائـع شهـرا او دارا عـلى ان يسكنها ....؛ لأنه شرط لا يـقـتـضـيـه الـعـقـد وفيـه منفعة لأحد المتعاقدين ؛ ولأنه عليه الصلاة والسلام ((نهى عـن بيع وسلف)) ؛ ولأنه لو كان الخدمة والسكنى يقابلهما شيء من الثمـن يكون إجارة في بيع ولو كان لا يقابلهما يكون إعارة في بيع . وقد((نهى النبي عليه الصلاة والسلام عن صفقتين في صفقة)).

وقـال الامـام ابـن الهـمـام رحـمه الله تعالىٰ : فيتناول كلا من الاعتبارين

المذكورين .رواه أحمد عن أسود بن عامر عن شريک عن سماک عن عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود عن أبيه قال : نهى رسول الله ﷺ عن صفقتين فـي صفقة أما ثبوته فقد رواه البزار في مسنده عن أسود بن عامر وأعل بعض طـرقـه ورجـح وقفه وبالوقف رواه أبو نعيم وأبو عبيد القاسم بن سلام .وأما مـعـنـاه فـفسـره الـمصنف بما سمعت وفسره أبو عبيد القاسم بن سلام بأن يـقـول الـرجـل لـلـرجل أبيعک هذا نقدا بكذا ونسيئة بكذا ويفترقان عليه انتهى .ورواية ابن حبان للحديث موقوفا ((الصفقة في الصفقتين ربا)) تؤيد تـفسيـر الـمـصـنف مع أنه أقرب تبادرا من تفسير أبي عبيد وأكثر فائدة فإن كـون الثـمـن عـلى تقدير النقد ألفا وعلى تقدير النسيئة ألفين ليس في معنى الربا بخلاف اشتراط نحو السكنى والخدمة.

(فتح القدير ۶/ ۴۱۰،ط:رشيديه)

قسم اول کی دوسری قسم (معاملہ ایک ہو اور شرط کی وجہ سے احد الفریقین کو زیادتی خالی عن العوض حاصل ہو) کا حکم:

اس کا حکم بھی یہی ہے کہ یہ ایسی شرط ہے جس کی وجہ سے فریقین میں سے ایک کو خالی عن العوض نفع اور زیادتی مل رہی ہے، لہٰذا یہ مستلزمِ ربا ہونے کی وجہ سے ناجائز اور مفسدِ عقد ہے۔

وقـال الـعلامة المرغيناني رحمه الله تعالى : وكذلک لو باع عبدا ...... عـلـى أن يـقـرضـه المشتري درهما أو على أن يهدى له هدية ؛ لأنه شرط لا يـقـتـضيـه الـعـقـد وفيـه منفعة لأحد المتعاقدين ؛ ولأنه عليه الصلاة والسلام ((نهى عن بيع وسلف)) . (الهداية ۳/ ۶۲،ط:رحمانيه)

وقال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : (و)لا (بيع بشرط).

وقـال الـعـلامة الطحطاوي رحمه الله تعالىٰ :وفي الدرر وانما فسد البيع بهـذا الشـرط لا نهـما اذا قصدا المقابلة بين المبيع والثمن فقد خلا الشرط

عن العوض وقد وجب البيع بالشرط فيه فكان زيادة مستحقة بعقد المعاوضة خالية عن العوض فيكون ربا وكل عقد بشرط الربا يكون فاسدا. (الطحطاوی علی الدر ۷۶/۳،ط:مکتبة العربية)

وقال العلامة الزيلعي رحمه الله تعالى : وما عدا ذلك من الشروط مفسد لما فيه من زيادة عرية عن العوض فيفضى إلى الربا ولأنه يقع بسببه المنازعة فيعرى العقد عن مقصوده ؛ لأن المقصود من شرع الأسباب فى المعاملات قطع النزاع ليختص به المباشر للسبب.

(تبيين الحقائق ۳۹۰/۴،ط:سعيد)

کس قسم کی شرط عرف سے جائز ہوتی ہے اور کس قسم کی نہیں؟

جن شروط کی وجہ سے زیادتی خالی عن العوض یعنی ربا لازم آتا ہے اوران شروط کومشروط کا جزءاور تابع بنانا بھی ممکن نہیں چونکہ ایسی شروط ہر صورت میں زیادتی خالی عن العوض ربا اور دوسرے کا حق ناحق کھانے کومستلزم ہوتی ہیں اور یہ امورنصوصِ قطعیہ سے ناجائز ہیں جیسے نصِ قرآنی﴿يايها الذين آمنوا لا تاكلوا اموالكم بينكم بالباطل الا ان تكون تجارة عن تراض منكم﴾[النساء: ۲۹] اورحدیث﴿المسلمون على شروطهم الا شرطا حرم حلالا او احل حراما﴾ (مشکوۃ:۲۵۵،ط:قدیمی) اس لیے عرف اورتعامل کی وجہ سے بھی ایسی شرطیں جائز نہیں ہوں گی کیونکہ یہ عرف اور تعامل حقیقت میں نص کے خلاف ہے اورنص کے خلاف عرف بتصریح فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ غیر معتبر ہے، چنانچہ حضرات فقہائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے تصریح فرمائی ہے:

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : ولا اعتبار للعرف المخالف للنص لان العرف قد يكون على باطل.

(رسائل ابن عابدين ۱۱۵/۲،ط:سهيل اكيدمى)

وقال رحمہ اللہ تعالیٰ ایضا: فھذہ کلہ صریح فیما قلنا من العمل بالعرف ما لم یخالف الشریعۃ کالمکس والربا ونحو ذلک.

(شرح عقود رسم المفتی ،ص: ۸۰،ط:البشری)

البتہ جن شروط کومشروط کا جزء بنانا ممکن ہو چونکہ عرف کی وجہ سے وہ مشروط کا جزء بن کر خالی عن العوض نہیں رہتیں لہٰذا عرف کی وجہ سے وہ جائز ہوجاتی ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا عبارات سے واضح ہے۔

تنبیہ نمبر۲: علماء کو چاہیے کہ اس ایڈوانس کی یہ ناجائز اور خلافِ شرع عرف اور تعامل کو تبدیل کرا کے اس کی جگہ بوقتِ ضرورت یہ صورت رائج اور متعارف کرائی جائے کہ مالک اور مُوجر کو یکمشت جتنی رقم کی ضرورت ہے وہ کرایہ کی مد میں پہلے وصول کرلے۔ یہ ایسی صورت ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔خود بعض مجوزین حضرات نے بھی اس کو بہتر فرمایا ہے۔چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

''البتہ ان طریقوں میں سے زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جتنی رقم سیکیورٹی ڈپازٹ کی مد میں وصول کی جاتی ہے اتنی رقم کو کل مدتِ اجارہ کے پیشگی کرائے کے طور پر وصول کیا جائے ،یعنی کرایہ کے دو حصے ہوں: ایک حصہ ماہانہ یا سالانہ وصول کیا جائے اور ایک حصہ کل مدتِ اجارہ کے مقابل پیشگی واجب الاداء ہو............بعض غیر سودی بینکوں نے اسی طریقے کو اختیار کیا ہے۔(غیر سودی بینکاری،ص:۲۷۵)

جن غیر سودی بینکوں نے اس طریقہ کو اختیار کیا ہے ان کے نام اور تحریری ثبوت مطلوب ہیں، کیونکہ بظاہر یہ بینک کے تشخص اور ''خرما'' کے کسی درجہ میں خلاف ہے۔اس لئے کہ اس کی وجہ سے ماہانہ قسط میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور آئیگی اور فسخ اجارہ کی صورت میں یہ کمی بینک کے گلے میں نقصان بن کر پڑ سکتی ہے اور بینک کا مطالبہ علماء سے شریعت معلوم کر کے عمل

کرنا نہیں، بلکہ شریعت کو توڑ مروڑ کر سودی اور خلافِ شرع نظام کے لیے شرعی لباس بنوانا ہے، ورنہ بعض کے بجائے سارے نام نہاد اسلامی بینکوں کو اس صحیح، جائز، اتفاقی اور بہتر طریقہ کا پابند بناتے۔اذ لیس فلیس۔

﴿خلافِ شرع امر نمبر۲: اجارہ اور اس میں مرمت کی شرط﴾

قانونِ اجارہ:

اجارہ کا ایک قانون یہ بھی ہے کہ جس عین کی منفعت کی اجرت لی جاتی ہے اگر وہ عین مستاجر اور کرایہ دار کی تعدی اور کوتاہی کے بغیر خراب ہو کر منفعت دینا چھوڑ دے تو مالک اور مُوجِر پر اس کی مرمت اور قابلِ منفعت بنانا لازم ہے اور جب تک مرمت کر کے قابلِ منفعت نہ بنائے اس مدت کا کرایہ مستاجر کے ذمہ لازم نہیں۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: (تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد......)............و كشرط ...... مرمة الدار أو مغارمها............

و قال العلامة الشامي رحمه الله تعالىٰ: قوله : (و مرمة الدار أو مغارمها) قال في البحر : و في الخلاصة معزيا الى الأصل: لو استأجر دارا على أن يعمرها و يعطي نوائبها تفسد ، لأنه شرط مخالف لمقتضى العقد اهـ فعلم بهذا أن ما يقع في زماننا من اجارة أرض الوقف بأجرة معلومة على أن المغارم و كلفة الكاشف على المستأجر أو على أن الجرف على المستأجر فاسد كما لا يخفى اهـ

أقول : و هو الواقع في زماننا ولكن تارة يكتب في الحجة بصريح الشرط فيقول الكاتب : على أن ما ينوب المأجور من النوائب و نحوها كالدك و كرى الأنهار على المستأجر، و تارة يقول: و توافقا على أن ما

یـنـوب الخ. و الظاهر: أن الکل مفسد ؛ لأنه معروف بینهم و ان لم یذکر، و المعروف کالمشروط. تأمل (الشامیة ۹ /۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ط رشیدیة)

و قـال العـلامة الـحـصـکـفـی رحـمــه الـلـه تعالیٰ : (و) تفسد (بجهالة الـمسـمـی) کـلـه أو بعضه کتسمیة ثوب أو دابة أو مائة درهم علی أن یرمها المستأجر لصیرورة المرمة من الأجرة فیصیر الأجر مجهولا ......

و قـال العلامة الشامی رحمه الله تعالیٰ : قوله : (کتسمیة ثوب أو دابة) مثـال لمجهول الکل و ما بعده مثال مجهول البعض و یلزم منه جهالة الکل ، فـصح قوله بعد : فیصیر الأجر مجهولا؛ قوله: (لصیرورة المرمة) أی: نفقتها (الشامیة ۹/۸۰ رشیدیة)

و قـال الـعـلامة الحصکفی رحمه الله تعالیٰ : و فی التبیین : لو انقطع ماء الـرحـی و البیت مما ینتفع به لغیر الطحن فعلیه من الأجر بحصته لبقاء بعض الـمـعقود علیه ، فاذا استوفاه لزمته حصته (فان لم یخل به أو أزاله المؤجر) أو انتفع بالمخل (سقط خیاره) لزوال السبب.

(وعمارة الدار) المستأجرة (و تطیینها و اصلاح المیزاب و ما کان من البـنـاء عـلـی رب الدار) و کذا کل ما یخل بالسکنی (فان أبی صاحبها) أن یـفـعل (کان للمستأجر أن یخرج منه الا أن یکون) المستأجر (استأجرها و هی کذلک و قد رآها) لرضاه بالعیب.(الشامیة ۹ /۱۳۳ ط رشیدیة)

وقـال الـعلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ :(قوله: وانقطاع ماء الرحی) فـلـو لـم یـفسـخ حتـی عـاد الماء لزمت ویرفع عنه من الأجر بحسابه وقیل: حسـاب أیام الانقطاع وقیل: بقدر حصة ما انقطع من الماء والأول أصح لأن ظـاهـر الـروایة یشهـد له فإنه قال فی الأصل: الماء إذا انقطع الشهر کله ولم یفسخها المستأجر حتی مضی الشهر فلا أجر علیه فی ذلک.

(الشامیة ۹/۱۳۱،ط:رشیدیه)

مندرجہ بالا عبارات سے مستنبط قانون کا حاصل:

ان عبارات سے جو قانون مستنبط ہوا، اس کا حاصل یہ ہے کہ شیءموجَر (کرایہ پر دی گئی چیز) کے جن اجزاء کا کرایہ موجِر (مالک) لیتا ہے ان پر اگر شیءموجَر (کرایہ پر دی گئی چیز) سے نفع حاصل کرنا موقوف ہوگا تو وہ موجِر (مالک) ہی کے ذمہ ہیں اور جن چیزوں کا کرایہ موجِر (مالک) نہیں لیتا اور شیءموجَر (کرایہ پر دی گئی چیز) سے انتفاع ان پر بھی موقوف ہے تو وہ مستأجر (کرایہ دار) ہی کے ذمہ ہوں گے......اصلاً بھی......اور اگر شرط لگائی گئی تو شرطاً بھی۔

اجارہ بنوکیہ کا حکم:

اس قانون کے پیش نظر اب گاڑی کے اجارہ پر غور کیجیے، مستأجر کے ذمہ گاڑی کے تمام پرزوں کا کرایہ ہے یا بعض کا؟ ظاہر ہے کہ کرایہ صرف باڈی کا نہیں بلکہ چالو گاڑی کا ہے جس کا پلگ بھی صحیح ہے، ٹیوننگ کی ضرورت بھی نہیں، ٹائر بھی صحیح ہیں، رنگ روغن اور باڈی کا شیپ بھی درست ہے، بیٹری بھی نئی اور کام کر رہی ہے لہٰذا یہاں گاڑی کے اجارہ میں مستأجر انجن کے تمام پرزوں کی اجرت دے رہا ہے۔ پلگ کا کرایہ، انجن کی اچھی حالت کا کرایہ، ٹائروں کا کرایہ اور بیٹری وغیرہ تمام چیزوں کا کرایہ دے رہا ہے لہٰذا ان سب کی مرمت اور تبدیلی کی ذمہ داری موجر پر ہوگی۔ البتہ جن چیزوں کا کرایہ نہیں اور مستأجر نفع حاصل کرنے کے لئے ان کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ مستأجر ہی کے ذمہ ہونگے۔

الحاصل قانون اجارہ کے مطابق چونکہ ٹائر، بیٹری، پلگ، اور انجن کو قوت پر لانے کے لئے ٹیوننگ وغیرہ اخراجات سب شرعاً بینک کے ذمہ ہیں ان کو مستأجر کے ذمہ لگانا قانون اجارہ کے خلاف اور مفسد عقد ہے۔

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی عبارت پر تبصرہ:

اس کتاب میں اجارۂ بنوکیہ کی اجازت چار شرائط سے دی گئی ہے۔ان شرائط کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان شرائط کے ساتھ اجارہ ہو تو شاید اس کے جواز میں اہل فتوی کی دو رائیں نہ ہوں'' (غیر سودی بینکاری، ص: ۲۴۰)

تبصرہ: اولاً: اس اجارہ پر اشکال یہ ہے کہ گاہک اس کو اجارہ سمجھ کر عقد نہیں کرتا، بلکہ بیع سمجھ کر عقد کرتا ہے۔اور عقد کرنے کے بعد اس کے ساتھ معاملہ بھی مملوک شیء کی طرح کرتا ہے، کہیں گفتگو ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ بینک سے گاڑی خریدی ہے، بسا اوقات آگے دوسرے کو بیچ بھی دیتا ہے...... بہر حال سوال یہ ہے کہ گاہک کے ذہن میں بوقت عقد یہ تصور کہ میں اجارہ اور کرایہ پر گاڑی لے رہا ہوں، خرید تا نہیں ہوں، ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ضروری ہے تو پھر یہ اجارہ کیونکر صحیح ہوگا؟

ثانیاً: کتاب میں جن شرائط کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی کلام سے خالی نہیں ہیں۔آگے تفصیل سے ملاحظہ فرمایئے گا:

''**شرط (۱):** مالیاتی ادارہ جو گاڑی کرایہ پر دے رہا ہے کرایہ داری کی مدت کے دوران گاڑی کے مالک کی حیثیت سے وہ ملکیت کی پوری ذمہ داری اٹھائے یعنی اگر وہ گاڑی گاہک کی کسی غفلت یا تعدی کے بغیر تباہ ہو جائے تو نقصان بینک کا ہو''۔

(غیر سودی بینکاری ۲۳۹)

تبصرہ: اگر غور کر کے حقیقت کو دیکھا جائے تو بینک کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، کیونکہ بینک یہ نقصان ''تکافل'' سے وصول کرتا ہے اور تکافل میں جتنی رقم جمع کرائی جاتی ہے اس کو اصل قیمت سے ملا کر گاہک سے مع نفع قسط وار وصول کیا جاتا ہے اس لئے یہ کہنا کہ بینک پوری

گاڑی کا ذمہ دار ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے کسی طرح بھی درست معلوم نہیں ہوتا، الفاظ میں لکھنا اور زبان سے کہنا دوسری بات ہے۔

چنانچہ تحریر ہے:

''یہ درست ہے کہ غیر سودی بینک تکافل کے تحت اس نقصان سے بقدر امکان تحفظ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کا تحفظ ہر مالک حاصل کرسکتا ہے اس سے اُس کے ضمان کی نفی نہیں ہوتی'' (غیر سودی بینکاری ۲۴۱)

تبصرہ: الفاظ میں تو ضمان کی نفی نہیں ہوسکتی لیکن حقیقت میں تو ہے، کیونکہ جب تکافل کی رقم بھی بینک گاڑی کی قیمت میں ملا کر مجموعہ مع منافع گاہک سے وصول کرتا ہے تو ضمان حقیقت میں گاہک کے ذمہ آ گیا...... ہاں! اگر تکافل کی رقم بینک گاڑی کی قیمت میں نہیں ملاتا تو پھر یہ بات ظاہراً و باطناً ہر اعتبار سے درست ہے، لیکن اذ لیس فلیس۔

یہ بھی تحریر ہے:

''اور تکافل کے ذریعے ہر نقصان کی پوری تلافی ہو بھی نہیں سکتی اور بعض اوقات تکافل کے ادارے ناکام بھی ہوجاتے ہیں ان ساری صورتوں میں نقصان بینک ہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۲۴۱)

تبصرہ: یہ احتمالاتِ بعیدہ ہیں جن کا اصل حقیقت پر کچھ فرق نہیں پڑنا چاہیے۔

الحاصل! یہ کہنا کہ بینک ذمہ داری اٹھاتا ہے صرف الفاظ کی ہیرا پھیری ہے، حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔

''شرط (۲): گاڑی کے بنیادی طور پر قابل انتفاع ہونے کے لئے جتنی مرمت کی ضرورت ہے، اس کے اخراجات بینک کے ذمہ ہوں''۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۲۴۰)

تبصرہ: ''بنیادی'' لفظ سے بعض ضروری پرزوں سے جان چھڑانا مقصود ہے ورنہ

صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ جن پرزوں کا کرایہ لیا جارہا ہے ان کی مرمت وغیرہ بینک کے ذمہ ہو۔ کیا ٹائر، پلگ، بیٹری وغیرہ کی مرمت کی ضرورت گاڑی کے بنیادی طور پر قابل انتفاع ہونے کے لئے نہیں؟ یہ بنیادی اور غیر بنیادی کا فرق اور اس کی تفصیل اور حکم کا فرق کس کتاب میں ہے؟

مرمت کی تفصیل:

گاڑی کے اجارہ میں بینک پلگ، ٹیوننگ، ٹائر، بیٹری اور سروس وغیرہ اخراجات مستأجر پر ڈالتا ہے۔

اس کے جواز کو جن عبارات سے ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے انصاف کی بات یہ ہے کہ ان سے بجائے جواز کے عدم جواز ہی ثابت ہوتا ہے، تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

پہلی عبارت جو نقل فرمائی ہے وہ زمین کے اجارے سے متعلق ہے اس عبارت سے پہلے ایک قانون بیان کیا گیا ہے:

"موجر مستأجر پر کسی ایسے عمل کی شرط عائد نہیں کرسکتا جس کا اثر مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد بھی معتد بہ طور پر باقی رہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اجارے میں ایسی شرط عائد کررہا ہے جس کا فائدہ اجارہ ختم ہونے کے بعد وہ خود اٹھائے گا۔ مثلاً کوئی شخص زمین دیتے وقت یہ شرط عائد کرے کہ اس میں کوئی ایسی عمارت یا چاردیواری بنادو جو بعد میں بھی باقی رہے"۔ (غیر سودی بینکاری، ص: ۲۵۸)

اور زمین کے اجارے سے متعلق یہ عبارات فقہ نقل فرمائی ہیں:

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

(و ان شرط أن يثنيها أو يكرى أنهارها أو يسرقنها أو يزرعها بزراعة أرض أخرى لا كاجارة السكنى بالسكنى) لأن أثر التثنية و كرى الأنهار و

السرقنة يبقى بعد انقضاء مدة الاجارة فيكون فيه نفع صاحب الأرض و هو شرط لا يقتضيه العقد فيفسد كالبيع، و لأن مؤجر الأرض يصير مستأجرا منافع الأجير على وجه يبقى بعد المدة فيصير صفقة فى صفقة و هو مفسد أيضا لكونه منهيا عنه حتى لو كان بحيث لا يبقى لفعله أثر بعد المدة بأن كانت المدة طويلة أو كان الريع لا يحصل الا به لا يفسد اشتراطه، لأنه مما يقتضيه العقد؛ لأن من الأراضى ما لا يخرج الريع الا بالكراب مرارا و بالسرقنة، و قد يحتاج الى كرى الجداول و لا يبقى أثره الى القابل عادة، بخلاف كرى الأنهار، لأن أثره يبقى الى القابل عادة، و فى لفظ الكتاب اشارة اليه حيث قال : كرى الانهار، لأن مطلقه يتناول الأنهار العظام دون الجداول و استئجار الأرض ليزرعها بأرض أخرى ليزرعها الآخر يكون بيع الشيء بجنسه نسيئة و هو حرام لما عرف فى موضعه و كذا السكنى بالسكنى أو الركوب بالركوب الى غير ذلك من المنافع.(باب الاجارة الفاسدة ۶/ ۱۳۱ ط: سعید)

(مؤجر نے) اگر یہ شرط لگائی کہ (مستأجر) اس زمین کو جوتے گا یا اس میں نہر کھودے گا یا کسی دوسری زمین کے بدلے میں اس میں کھیتی باڑی کرے گا تو یہ جائز نہیں جس طرح کہ گھر میں رہائش کا کرایہ رہائش ہی کے ذریعے سے وصول کرنے کی شرط ناجائز ہے اس لئے کہ زمین جوتنے، نہر کھودنے اور کھاد ڈالنے کا اثر مدتِ اجارہ کے ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، جس میں مالکِ زمین (مؤجر) کے لئے نفع ہے اور یہ ایسی شرط ہے جس کا عقد تقاضہ نہیں کرتا لہٰذا بیع کے فاسد ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شرط بھی فاسد ہوگی۔اور اس لئے کہ زمین اجارہ پر دینے والا خود اجیر کے منافع کو اس طرح اجارہ پر لینے والا بن جائے گا جو مدتِ اجارہ گزرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، لہٰذا یہ عقد در عقد ہے جو کہ مفسدِ عقد ہے اس لئے کہ اس طرح عقد کرنا ممنوع ہے۔ ہاں اگر ایسا عمل ہو جس

کا اثر مدتِ اجارہ گزرنے کے بعد باقی نہ رہے اس طور پر کہ مدت ہی لمبی ہو یا اس کی نشو نما اسی سے حاصل ہوتی ہو تو پھر اس کی شرط لگانا مفسدِ عقد نہیں ہوگا اس لئے کہ یہ ایسی چیز ہے جس کا عقد تقاضہ کرتا ہے کیونکہ بعض زمینوں کی پیداوار بار بار پانی دینے اور کھاد ڈالے بغیر نہیں نکلتی اور بسا اوقات چھوٹے نالوں کے کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا اثر عموماً سال تک باقی نہیں رہتا برخلاف نہر کھودنے کے کیوں کہ اس کا اثر سال تک باقی رہتا ہے، اور کتاب کے لفظ میں اس کی طرف اشارہ ہے کیونکہ (مصنف) نے فرمایا (نہروں کی کھدائی) مطلقاً ذکر کرنا بڑے نہروں کو تو شامل ہوسکتا ہے، نالوں کو نہیں اور زمین خود زراعت کے لئے اجارہ پر لینا اور اسکے بدلے میں دوسری زمین دینا تاکہ دوسرا اس میں زراعت کرے یہ چیز کو ہم جنس کے بدلے ادھار پر فروخت کرنا ہے جو کہ حرام ہے جس کی بحث اپنی جگہ پر معلوم ہو چکی ہے، اسی طرح رہائش کے بدلے یا سواری کا سواری کے بدلے، اس جیسی اور بہت سارے منافع کا اجارہ کرنا ﴾

اور ردالمحتار میں ہے:

(قوله : بشرط أن يثنيها)في القاموس : ثنّاه تثنية: جعله اثنين اهـ و هو على حذف مضاف أى يثنى حرثها، و فى المنح : ان كان المراد أن يردها مكروبة فلا شك فى فساده ، و الا فان كانت الارض لا تخرج الريع الا بالكراب مرتين لا يفسد ، و ان مما تخرج بدونه ، فان كان أثره يبقى بعد انتهاء العقد يفسد، لأن فيه منفعة لرب الأرض و الا فلا اهـ ملخصاً، و ذكر فى التتارخانية عن شيخ الاسلام ما حاصله : أن الفساد فيما اذا شرط ردها مكروبة بكراب يكون فى مدة الاجارة، أما اذا قال : على أن تكربها بعد مضىّ المدة أو أطلق، صح و انصرف الى الكراب بعده، قال : و فى الصغرى : و استفدنا هذا التفصيل من جهته و به يفتى اهـ قلت : و وجهه أن الكراب يكون حينئذ من الأجرة ، تأمل.

(قوله : أن يحرثها) فالحرث هو الكرب و هو اثارة الأرض للزراعة كالكراب، قاموس. (قوله : أن يكرى) من باب رمى : أى يحفر . (قوله: العظام) لأن أثره يبقى الى القابل عادةً، بخلاف الجداول أى الصغار فلا تفسد بشرط كربها، هو الصحيح ، ابن كمال . (قوله : أو يسرقنها) أى يضع فيها السرقين و هو الزبل لتهييج الزرع ط. (قوله: فلو لم تبق) بأن كانت المدة طويلة لم تفسد، لأنه لنفع المستأجر فقط،(رد المحتار، باب الاجارة الفاسدة، ج ٦ ص ٥٩، ٦٠، ط: ايچ ايم سعيد)

﴿منح میں ہے کہ اگر مراد یہ ہے کہ وہ (مستأجر) اس کو جوتا ہوا واپس کرے گا تو اس کے فساد میں کوئی شک نہیں ورنہ اگر زمین ایسی ہو کہ پیداوار دو دفعہ جوتے بغیر نہیں نکلتی تو بیع فاسد نہ ہوگی اور بعض زمین ایسی ہوتی ہے کہ جو پیداوار بغیر جوتے نکال سکتی ہو اور پھر اس کا اثر عقدِ اجارہ تک باقی رہتا ہو تو یہ عقد فاسد ہوگا اس لئے کہ اس میں مالکِ زمین کا نفع ہے، اور اگر باقی نہیں رہتا تو پھر نا جائز نہیں۔ تا تار خانیہ میں شیخ الاسلام سے منقول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ فساد اس صورت میں ہے کہ جب زمین کو جوتا ہوا واپس کرنے کی شرط مدتِ اجارہ کے اندر ہو۔

بہرحال اگر یہ کہے کہ اس شرط پر اجارہ کے لئے دیتا ہوں کہ مدتِ اجارہ گزرنے کے بعد تو اس کو جوتے گا، یا مطلق ذکر کرے تو یہ صحیح ہے اور اس کے اطلاق کو مدتِ اجارہ گزرنے کے بعد جوتنے کی طرف پھیرا جائے گا............(قولہ العظام) اس لئے کہ اس کا اثر عادتاً سال تک باقی رہتا ہے برخلاف چھوٹے قسم کے نالوں کے، صحیح قول یہ ہے کہ جوتنے کی شرط لگانے سے اجارہ فاسد نہیں ہوتا، ابن کمال............(قولہ : اگر باقی نہ رہے) اس طرح کہ مدت لمبی ہو تو فاسد نہ ہوگا کیونکہ یہ مستأجر کے نفع کے لئے ہے﴾

اور درمختار میں ہے:

”(و صحت لو استأجرها على أن يكربها و يزرعها أو يسقيها و يزرعها)

لأنه شرط يقتضيه العقد"

اس کے تحت علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"(قوله : لأنه شرط يقتضيه العقد) لأن نفعه للمستأجر فقط"

(ایضاً ج ٦ ص ٦٠)

اس کے بعد تحریر ہے:

"حاصل یہ ہے کہ اگر مستأ جر پر عین موجرہ کے استعمال کے سلسلے میں کوئی ایسی شرط لگائی جائے جس کا فائدہ مستأ جر ہی کو پہنچے اور اس کا معتد بہ اثر اجارہ ختم ہونے کے بعد باقی نہ رہے تو ایسی شرط جائز ہے" (غیر سودی بینکاری، ص:۲۶۱)

ان تمام عبارات کا مقصد یہ قانون بتانا ہے کہ وہ چھوٹی موٹی مرمت جس کا تعلق استعمال سے ہے اور اس کا فائدہ مستأ جر (کرایہ دار) کو ہی حاصل ہوتا ہے، مستأ جر (کرایہ دار) کے ذمہ لگانا جائز ہے۔

تبصرہ: زمین کے اجارے سے متعلق جو عبارات اِس قانون کے ثبوت کے لئے نقل کی گئی ہیں، اگر ان عبارات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو کتاب "غیر سودی بینکاری" میں بیان کردہ قانون کے برخلاف، یہ قانون مستنبط ہوتا ہے کہ شیءِ موجَر (کرایہ پر دی گئی چیز) سے مستأ جر (کرایہ دار) کو استفادہ اور نفع حاصل کرنے کے لئے شیءِ موجَر (کرایہ پر دی گئی چیز) کے علاوہ مزید جن چیزوں اور امور کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

(ا) ان امور کا فائدہ صرف مستاجر (کرایہ دار) کو حاصل ہو۔

حکم: وہ مستأ جر (کرایہ دار) کے ذمہ ہیں اور اگر موجِر (مالک) نے مستأ جر (کرایہ دار) کے ذمہ شرطاً بھی ان کو ذکر کیا تو بھی جائز ہے کیونکہ یہ مقتضائے عقد کے موافق اور ملائم ہیں۔

قال العلامة الشلبی رحمه الله تعالیٰ فی حاشیته علی التبیین: قوله : (لأن أثـر التثنية و كرى الأنهار الخ) و الأصل هنا أن ما كان ملائما للعقد لا يكون مـفسـدا لـه ثـم بـعـد ذلک نقول : انما تستأجر الأراضی لمنفعة المستأجر خـاصة فـكـل فـعـل ينتفع به المستأجر خاصة كالكراب و الزراعة و السقی يكون ملائما للعقد.

(تبیین الحقائق، کتاب الاجارۃ، باب الاجارۃ الفاسدۃ ۶ / ۱۳۱،ط: سعید)

(۲) وہ امور جن کا فائدہ مستاجر (کرایہ دار) اور موجر (مالک) دونوں کو حاصل ہو۔

حکم: ان کی شرط لگانا جائز نہیں، کیونکہ جو چیز مستاجر (کرایہ دار) کے نفع کے لئے دی گئی ہو اس سے مستاجر (کرایہ دار) کا نفع تو مقتضائے عقد کے موافق ہے لیکن موجر (مالک) کا اس سے نفع حاصل کرنا، دو وجہوں سے مقتضائے عقد کے خلاف ہے:

(۱) ایک وجہ یہ ہے کہ یہ صفقہ فی صفقہ کو مستلزم ہے، کیونکہ یہ موجر (مالک) مستاجر (کرایہ دار) کے عمل سے نفع حاصل کر کے گویا مستاجر (کرایہ دار) کا مستاجر (کرایہ دار) بن کر اس کے منافع کو خرید رہا ہے۔ کما صرح فی تبیین الحقائق:

قـال الامـام الـزيـلـعـی رحـمه الله تعالیٰ: (و ان شرط أن يثنيها أو يكرى أنهـارهـا أو يسـرقـنهـا أو يـزرعهـا بـزراعة أرض أخـرى لا كاجارة السكنی بـالسكنی) **لأن أثـر التثـنية و كـرى الأنهـار و السرقنة يبقى بعد انقضاء مدة الاجـارـة فيـكون فيه نفع صاحب الأرض و هو شرط لا يقتضيه العقد فيفسد كالبيع، و لأن مؤجر الأرض يصير مستأجرا منافع الأجير على وجه يبقى بعد الـمدة فيصير صفقة فی صفقة و هو مفسد أيضا لكونه منهيا عنه** حتی لو كان بـحيـث لا يبـقـى لفعله أثر بعد المدة بأن كانت المدة طويلة أو كان الريع لا يـحـصل الا به لا يفسد اشتراطه، لأنه مما يقتضيه العقد؛ لأن من الأراضی ما

لا يخرج الريع الا بالكراب مرارا و بالسرقنة، و قد يحتاج الى كرى الجداول و لا يبقى أثره الى القابل عادة، بخلاف كرى الأنهار، لأن أثره يبقى الى القابل عادة.

(تبيين الحقائق، كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة ٦ / ١٣١)

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں احد العاقدین کا نفع ہے، اور یہ بھی مفسد عقد ہے۔

قال الامام الزيلعى رحمه الله تعالىٰ: (و ان شرط أن يثنيها أو يكرى أنهارها أو يسرقنها أو يزرعها بزراعة أرض أخرى لا كاجارة السكنى بالسكنى) **لأن أثر التثنية و كرى الأنهار و السرقنة يبقى بعد انقضاء مدة الاجارة فيكون فيه نفع صاحب الأرض و هو شرط لا يقتضيه العقد فيفسد كالبيع،**

و قال العلامة الشلبى رحمه الله تعالىٰ : و كل فعل ينتفع به المؤجر خاصة يكون مخالفا للعقد مفسدا له كشرط ابقاء السرقين و رد الأرض مكروبة و هو أحد تأويلى التثنية و تكرار الكراب و هو التأويل الآخر فى التثنية ، قال الصدر الشهيد فى شرح الجامع الصغير : أما التثنية و هى أن يردها مكروبة عند البعض و أن يكربها مرتين عند البعض و هو الصحيح فلأنه شرط لا يقتضيه العقد **و لأحد المتعاقدين فيه منفعة فصار مفسدا** اهـ اتقانى مع حذف.

(تبيين الحقائق، كتاب الاجارة، باب الاجارة الفاسدة ٦ / ١٣١)

چونکہ مستأجر نے زراعت کے لئے جو زمین کرایہ پر لی ہے وہ ایسی زمین ہے جس میں چھوٹی نالیاں وغیرہ نہیں ہیں اور صاحبِ ارض ان نالیوں کا کرایہ وصول نہیں کرتا اس لیے زمین سے استفادہ کے لئے اگر زمین (موجَر) کے علاوہ نالیوں اور منڈیروں کی ضرورت

ہوگی تو وہ مستأجر ہی کے ذمہ ہوگا کیونکہ موجر نہ تو ان کا کرایہ لیتا ہے اور نہ اس کو ان کی ضرورت ہے۔

البتہ اگر زمین میں پہلے سے چھوٹی نالیاں اور منڈیر وغیرہ بنے ہوئے ہیں اور موجر زمین کے ساتھ ان کا کرایہ بھی وصول کرتا ہے تو پھر ان کی مرمت وغیرہ بھی موجر ہی کے ذمہ ہوگی۔ بڑی نہر کا چونکہ زمین کے ساتھ، موجر کرایہ لے رہا ہے اس وجہ سے اس کی کھدائی مستأجر کے ذمہ لگانا درست نہیں، یہی وجہ ہے کہ نہری زمین کا کرایہ بنسبت غیر نہری زمین کے زیادہ ہوتا ہے۔

الحاصل ان پیش کردہ عبارات کا مسئلہ زیر بحث سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ مسئلہ زیر بحث میں موجر بعض ان پرزوں کی مرمت کا خرچ اور ان کو قابل انتفاع بنانے کی ذمہ داری مستأجر پر ڈالتا ہے جن کا وہ کرایہ بھی وصول کرتا ہے۔ جبکہ اس کا حکم مستقل طور پر فقہ کے اندر موجود ہے۔ جس کی تفصیل ابتداء میں ''قانونِ اجارہ'' کے تحت لکھی گئی ہے۔

> ''شرط (۳): اجارہ کے عقد میں یہ شرط نہ ہو کہ مدت اجارہ کے بعد یہ گاڑی مستاجر کو بیچ دی جائے گی، یا ہبہ کردی جائے گی''۔(غیر سودی بینکاری، ص:۲۴۰)

تبصرہ: اسلامی نامی بینکوں کے اجارہ میں ''المعروف کالمشروط'' کے قاعدہ کے مطابق یہ بطور شرط ہی ہے۔ اگر بینک میں ہمت ہے تو ذرا اردو میں صاف لکھ کر گاہک کو بتادے کہ اتنے سالوں کے بعد ہم گاڑی واپس لے لیں گے۔ ہم آپ کو دینے کے پابند نہیں اور کم از کم ایک آدھ مرتبہ اس پر عمل بھی کریں، دیکھیئے کیا ہوتا ہے؟

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کے قانون کا توڑ کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی دوسری عبارت سے:

آگے گدھے کے چارے اور غلام کے کھانے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ مستأجر کے

ذمہ ہیں یا نہیں؟ اور شیخ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالے سے تعامل اور عرف کی وجہ سے اس کو مستأجر کے ذمہ ٹھہرایا ہے پھر علامہ طحطاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اعتراض کا علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ سے جواب نقل فرمایا ہے اور گدھے کے چارے سے متعلق طویل المیعاد اجارہ میں اس کا چارہ مستأجر کے ذمہ لگایا ہے اور اس پر مبسوط کی عبارت سے استدلال فرمایا ہے۔(ملخصاً غیر سودی بینکاری، ص:۲۶۱،۲۶۲)

تبصرہ: اس تفصیل سے **اولاً:** تو یہ معلوم ہوا کہ کتاب ’’غیر سودی بینکاری‘‘ ص:۲۶۱ پر بیان کردہ یہ قانون کہ...... ’’اگر مستأجر پر عین موجرہ کے استعمال کے سلسلے میں کوئی ایسی شرط لگائی جائے جس کا فائدہ مستأجر ہی کو پہنچے اور اس کا معتد بہ اثر اجارہ ختم ہونے کے بعد باقی نہ رہے تو ایسی شرط جائز ہے‘‘...... صحیح نہیں، ورنہ اس قانون کے مطابق چارہ اور کھانا دونوں بدوں تعامل بھی مستأجر کے ذمہ ہونا چاہیئے، کیونکہ اس چارہ اور کھانے سے جو قوت حاصل ہوگی اس سے مستأجر ہی فائدہ اٹھائے گا نہ کہ موجر۔

ثانیاً: مدتِ اجارہ ختم ہونے کے بعد بھی اس مرمت کا اثر باقی رہتا ہے۔گاڑی ان تمام پرزوں اور ٹائروں سے چلتی ہے جو مستأجر نے مدتِ اجارہ میں تبدیل کئے تھے یا ان کی مرمت کی تھی۔اس لحاظ سے بھی یہ شرط جائز نہیں ہونی چاہیے۔

ثالثاً: مبسوط کی عبارت سے بھی استدلال صحیح نہیں بلکہ عرف وعادت کے پیش نظر اس عبارت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ چارہ موجر ہی کے ذمہ ہے اور ان کا جلدی کرنے کا تقاضا اس وجہ سے نہیں کہ چارہ پھر حاج دیں گے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کرایہ چالو ہو جائے گا، جیسے ٹیکسی کورنگی دارالعلوم سے چمڑا چورنگی تک خالی آنے کی صورت میں اس کا مالک کہتا ہے کہ پٹرول ضائع ہوا، اگر سواری بٹھاتے ہیں تو پھر یہ نہیں کہتے کہ پٹرول ضائع ہوا، اگرچہ

یہ ٹیکسیاں سواری سے پٹرول کے الگ پیسے نہیں لیتے۔اسی طرح گدھوں کے مالکان بھی کرایہ چالو ہونے پر یہ کہتے کہ ہم سے چارے کا بوجھ ساقط ہوگیا۔جس طرح یہ ٹیکسیاں پٹرول کے پیسے کرایہ میں محسوب کرتے ہیں وہ لوگ بھی محسوب کرتے ہوں گے،اور علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہی حیلہ صراحۃً درج ذیل عبارت میں تحریر فرمایا ہے جو ہماری بات کی واضح مؤید ہے۔

قال العلامة الحصكفى رحمه الله تعالىٰ: (تفسد الاجارة بالشروط المخالفة لمقتضى العقد فكل ما أفسد البيع) مما مر (يفسدها) كجهالة مأجور أو أجرة أو مدة أو عمل، و كشرط طعام عبد و علف دابة و مرمة الدار أو مغارمها و عشر أو خراج أو مؤنة رد. أشباه ......

و قال العلامة الشامى رحمه الله تعالىٰ: قوله : (كشرط طعام عبد و علف دابة) فى الظهيرية : استأجر عبدا أو دابة على أن يكون علفها على المستأجر، ذكر فى الكتاب أنه لا يجوز و قال الفقيه أبو الليث : فى الدابة نأخذ بقول المتقدمين، أما فى زماننا فالعبد يأكل من مال المستأجر عادة اهـ قال الحموى : أى : فيصح اشتراطه . و اعترضه ط بقوله : فرق بين الأكل من مال المستأجر بلاشرط و منه بشرط اهـ .

أقول : المعروف كالمشروط ، و به يشعر كلام الفقيه كما لا يخفى على النبيه ، ثم ظاهر كلام الفقيه أنه لو تعورف فى الدأبة ذلك يجوز، تأمل. و الحيلة أن يزيد فى الأجرة قدر العلف ثم يوكله ربها بصرفه اليها، و لو خاف أن لا يصدقه فيه فالحيلة أن يعجله الى المالك ثم يدفعه اليه المالک و يأمره بالانفاق فيصير أمينا، بزازية ملخصا.

و قال العلامة الرافعى رحمه الله تعالىٰ : قوله : (المعروف كالمشروط الخ) أى فيفسد العقد و ان لم يصرح بهذا الشرط، لأنه بمنزلة المنصوص

علیه، و هو لا يقتضيه العقد خصوصا مع جهالة مقدار ما يأكل العبد و جنسه لكن هذا حينئذ مخالف لكلام الفقيه بالكلية ، فان مقتضاه جواز الاجارة فى العبد لا الدابة و لعل وجه الجواز فيه مع الجهالة فى علفه أنها لا تفضى الى المنازعة بسبب أنه يأكل من مال المستأجر عادة كما يشير اليه قوله : أما فى زماننا الخ، فتكون مثل استئجار الظئر بطعامها.

(الشامية ۹ /۷۷ ، ۷۸ ، ۷۹ ط رشيدية)

الحاصل اصل قانون یہی ہے کہ جن پرزوں کا مستأجر کرایہ ادا کرتا ہے ان کی مرمت وغیرہ موجر کے ذمہ ہے اور جن کا کرایہ ادا نہیں کرتا وہ مستأجر کے ذمہ ہیں۔

خلافِ شرع امر نمبر۳: اجرت اور کرایہ کا مجہول ہونا:

قانونِ اجارہ وبیع:

اجارہ وبیع کی صحت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ معقود علیہ اور ثمن و اجرت معلوم ہوں، ورنہ عقد صحیح نہیں ہوگا۔ عقدِ بیع میں مبیع اور سامان اور اس کا ثمن اور قیمت کا معلوم ہونا ضروری ہے......اور اجارہ میں شےءِ موجَر کی منفعت اور اس کی اجرت وکرایہ کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

قال العلامة الحصكفى رحمه الله تعالىٰ : وشرطها: كون الاجرة والمنفعة معلومتين.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله : كون الأجرة والمنفعة معلومتين) أما الأول فكقوله بكذا دراهم أو دنانير وينصرف إلى غالب نقد البلد فلو الغلبة مختلفة فسدت الإجارة ما لم يبين نقدا منها فلو كانت كيليا أو وزنيا أو عدديا متقاربا فالشرط بيان القدر والصفة وكذا مكان الإيفاء لو له حمل ومؤنة عنده وإلا فلا يحتاج إليه كبيان الأجل ولو كانت ثيابا أو

عروضا فالشرط بیان الأجل والقدر والصفة لو غیر مشار إلیها ولو کانت حیوانا فلا یجوز إلا أن یکون معینا .بحر ملخصا . وأما الثانی فیأتی فی المتن قریبا.(الشامیة ۹/۹، رشیدیه)

معقود علیہ اور اجرت وثمن میں کمی بیشی کا قانون:

بائع اور مُوجِر کو معقود علیہ یعنی مبیع اور منفعت میں اضافہ کا تو حق ہے لیکن کمی کا حق نہیں ......اور اسی طرح ثمن واجرت میں کمی کا حق تو ہے لیکن اضافہ کا حق نہیں۔ جبکہ مشتری اور مستاجِر کو ثمن اور اجرت میں اضافہ کا حق ہے، کمی کا نہیں ......اور معقود علیہ میں کمی کا حق ہے لیکن اضافہ کا نہیں۔ (باحوالہ تفصیل آگے آرہی ہے)

اجارہ بنوکیہ کا حکم:

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ گاڑی کا اجارہ پوری مدت کا ہوتا ہے اور اجرت بعض مدت کی معلوم ہوتی ہے اور بعض کی مجہول، کیونکہ جس تناسب اور معیار کے ساتھ اجرت معلق کی گئی ہے وہ معیار مجہول ہے۔ بوقتِ عقد الگ ہے اور بوقتِ ادائے اجرت الگ۔ جس سے ثابت ہوا کہ بوقتِ عقد اجرت مجہول ہے، جبکہ صحتِ اجارہ کے لیے اجرت کا معلوم ہونا ضروری ہے، لہٰذا اس جہالت کی وجہ سے یہ اجارہ فاسد، ناجائز، بحکمِ ربا اور واجب الترک ہے۔

اگر کہا جائے کہ اصل کرایہ اس مدت کا بھی وہی ہے جو پہلی مدت میں طے ہوا ہے، البتہ اس میں پندرہ فیصد تک اضافہ کی شرط ہے......تو یہ بھی قانونِ اضافہ کے پیشِ نظر ناجائز ہے، کیونکہ اجرت کے طے ہونے کے بعد مالک اور مُوجِر کو شرعاً اجرت میں کمی کا اختیار تو ہے، اضافہ کا اختیار نہیں۔ لہٰذا یہ اضافہ شرعاً نہ معتبر ہے اور نہ بینک کے لیے لینا حلال اور جائز ہے۔

کتاب ’’غیرسودی بینکاری‘‘ کی عبارت:

’’............البتہ بڑے تجارتی اداروں کو جو مشینری وغیرہ کرایہ پر دی جاتی ہیں اس میں پہلی مدت کا کرایہ تو لگی بندھی رقم کی صورت میں متعین ہوتا ہے، لیکن بعد کی مدتوں میں اس میں ایک خاص تناسب سے اضافہ ہوتا رہتا ہے......(غیرسودی بینکاری، ص:۲۶۵)

(آگے لکھا ہے)

’’............دوسری صورت یہ ہے کہ ہر سال اجرت میں دس یا پندرہ فی صد اضافہ کرنا طے کرلیا جائے۔ بڑے تجارتی ادارے اگر بینک سے کوئی مشینری وغیرہ اجارے پر لیتے ہیں تو اس میں بنیادی طور پر یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلی مدتِ اجارہ کا تعین تو ایک لگی بندھی رقم سے ہوجاتا ہے اس کے بعد اجرت کو کسی معیار (benchmark) سے منسلک کیا جاتا ہے اور یہ درست ہے کہ یہ معیار وہ شرح سود و شرح منافع ہوتی ہے جس پر بینک آپس میں لین دین کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی عقد میں یہ مذکور ہوتا ہے کہ اگر یہ شرح ابتدائی اجرت سے پندرہ فی صد زیادہ بڑھ گئی تو اضافہ پندرہ فی صد سے زیادہ نہیں ہوگا‘‘۔(غیرسودی بینکاری، ص:۲۶۶)

تبصرہ: اولاً: عقد اجارہ اور عقد بیع کے تام ہونے کے بعد اجرت اور ثمن میں اضافہ اور کمی کا قانون پیش کیا جاتا ہے۔

ثانیاً: اس کے جواز کی جو تاویل پیش کی گئی ہے، اس کا بطلان اور رد۔

عقدِ بیع واجارہ کے مکمل ہونے کے بعد ثمن واجرت میں کمی اور بیشی کا قانون:

قانون اور قاعدہ یہ ہے کہ بیع میں مشتری اور اجارہ میں مستاجر اپنی رضائے تام سے بدوں کسی شرط اور دباؤ کے ثمن اور اجرت میں اضافہ کرسکتا ہے، البتہ کمی نہیں کرسکتا۔ اور بائع اور موجر ثمن اور کرایہ میں کمی کرسکتے ہیں، البتہ زیادتی اور اضافہ نہیں کرسکتے، ہاں! مبیع اور

شیءموجَر میں اضافہ کرسکتے ہیں۔

قال الامام المرغینانی رحمه الله تعالیٰ: و یجوز للمشتری أن یزید للبائع فی الثمن و یجوز للبائع أن یزید فی المبیع و یجوز أن یحط عن الثمن و یتعلق الاستحقاق بجمیع ذلک . فالزیادة و الحط یلتحقان بأصل العقد عندنا (الهدایة ۳ / ۸۰، ط:رحمانیة)

﴿علامہ مرغینانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:خریدار کے لئے جائز ہے کہ بائع کوثمن میں اضافہ کرکے دے اور بائع کے لئے مبیع میں اضافہ اورزیادت جائز ہےاورثمن سے کم کرنا بھی جائز ہے......لہٰذا زیادتی اورکمی ہمارے نزدیک اصلِ عقد کےساتھ ملیں گے﴾

فی الهندیة : الزیادة فی الثمن و المثمن جائزة حال قیامهما سواء کانت الزیادة من جنس الثمن أو غیر جنسه ، و تلتحق بأصل العقد . و لو ندم المشتری بعد ما زاد یجبر اذا امتنع . و فی الرد بالعیب و غیره تعتبر الزیادة کأنه باعه مع هذه الزیادة ، و اذا زاد فی الثمن لا بد أن یقبل الآخر فی المجلس حتی لو لم یقبل و تفرقا بطلت ، کذا فی الخلاصة.

(الهندیة ۳ / ۱۷۱)

﴿ہندیہ میں ہے،ثمن اورمبیع میں اضافہ اس وقت تک جائز ہے جب تک یہ دونوں قائم ہوں خواہ وہ زیادتی ثمن کی جنس سے ہو یاغیرِجنس سےاور یہ زیادتی اصلِ عقد سےمل جائے گی ،اگرمشتری زیادہ دینے کے بعد نادم ہوگیا تو جب وہ اس زیادتی کی ادائیگی نہ کرے تو اس پر جبر کیا جائیگا اورعیب وغیرہ کی وجہ سےلوٹانے میں بھی اس زیادتی کا اعتبار ہوگا یہ سمجھا جائے گا کہ یہ بیع گویا اس زیادتی کیساتھ کی گئی ہےاور جب ثمن میں زیادتی کرےتو دوسرے کے لئے مجلس میں قبول کرنا ضروری ہے اگرقبول نہ کیا اوردونوں جدا ہوگئے(مجلس بدل گئی) تو یہ زیادتی باطل ہوجائے گی،خلاصہ میں اسی طرح لکھا ہے﴾

و قال فی الهندیة : و اذا زاد الآجر أو المستأجر فی المعقود علیه أو فی

المعقود به ان كانت الزيادة مجهولة لا تجوز الزيادة سواء كانت من الآجر أو من المستأجر و ان كانت معلومة من جانب الآجر تجوز سواء كانت من جنس ما آجر أو من خلاف جنس ما آجر فان كانت من جانب المستأجر ان كانت من جنس ما استأجر لا يجوز و ان كانت من خلاف جنس ما استأجر يجوز ، كذا في الذخيره .(الهندية ۴ / ۴۳۹)

﴿ہندیہ میں ہے اجرت پر دینے والا یا لینے والا اگر معقود علیہ یا اس کی اجرت میں زیادتی کرے اور یہ مجہول ہو تو جائز نہیں، خواہ اجارے پر دینے والے کی طرف سے ہو یا لینے والے کی طرف سے، اور اگر اجرت پر دینے والے کی طرف سے زیادتی معلوم ہو تو جائز ہے خواہ وہ اس چیز کی جنس سے ہو جو اس نے اجرت پر دی ہے یا اس کے خلافِ جنس سے ہو، اور اگر مستأ جر (اجرت پر لینے والے) کی طرف سے ہو تو پھر وہ اگر شئ مستأ جر کی جنس سے ہے تو جائز نہیں (یعنی شےءِ مستاجَر بھی سکنیٰ ہو اور اضافہ بھی سکنیٰ کی صورت میں ہو)، خلافِ جنس سے ہے تو جائز ہے......﴾

چند جزئیات کا حکم:

اس قانون کے پیشِ نظر چند جزئیات کا حکم سمجھنا قانون کے سمجھنے اور اس تاویل کے بطلان کو سمجھنے میں معاون اور مدد ہو سکتا ہے۔ اس لئے ذیل میں چند جزئیات اور ان کا حکم ملاحظہ فرمائیے:

(۱) زید نے دو من گندم بکر پر ایک ہزار روپے میں فروخت کی، عقد کے تام ہونے کے بعد زید بائع نے ثمن میں سے سو روپے اپنی خوشی سے کم کئے اور کہا کہ بجائے ہزار کے نو سو روپے دے دو، یا مبیع یعنی گندم میں پانچ دس کلو کا اضافہ کر کے کہا کہ ہزار میں دو من دس کلو لے لو۔

حکم: قانونِ سابق کے پیشِ نظر یہ جائز ہے، اور بائع زید کی جانب سے ثمن میں کمی اور

مبیع میں اضافہ جو ہوا ہے وہ نافذ اور لازم ہے۔

(۲) زید نے دو من گندم بکر پر ایک ہزار روپے میں فروخت کی، عقد کے تام ہونے کے بعد بکر مشتری نے ثمن میں اپنی رضائے تام سے سو روپے کا اضافہ کیا اور کہا کہ ثمن بجائے ہزار کے گیارہ سو روپے ہو گئے۔

حکم: قانونِ مذکور کے تحت یہ صورت بھی جائز ہے، اور یہ اضافہ ثمن کا حصہ ہے۔

(۳) زید نے دو من گندم بکر پر ایک ہزار روپے میں فروخت کی، عقد کے تام ہونے کے بعد زید بائع نے بکر سے کہا کہ ثمن بجائے ہزار کے گیارہ سو دینا پڑے گا، یا بکر مشتری نے کہا کہ بجائے ہزار کے ثمن نو سو روپے تم کو لینا پڑے گا۔

حکم: قانونِ مذکور کی رو سے زید کا اضافہ اور بکر کی کمی، دونوں خلافِ شرع اور ناجائز ہیں۔

(۴) خالد نے اپنے مکان کے تین کمرے بشیر کو پانچ ہزار روپے ماہوار کے حساب سے تین ماہ کے لئے کرایہ پر دیئے۔ عقدِ اجارہ کے تام ہونے کے بعد خالد موجر نے اپنی رضائے تام سے اجرت میں سے ایک ہزار کم کر کے بشیر سے کہا کہ ماہوار اجرت بجائے پانچ کے چار ہزار دیا کرو، یا ایک کمرہ کا اضافہ کر کے بشیر سے کہا کہ پانچ ہزار کی اجرت میں بجائے تین کے چار کمرے استعمال کرو۔

حکم: قانونِ مذکور کے پیشِ نظر یہ جائز ہے۔ خالد کی جانب سے کرایہ کی مذکورہ کمی یا شیء موجَر میں اضافہ نافذ اور لازم ہوگا۔

(۵) خالد نے اپنے مکان کے تین کمرے بشیر کو پانچ ہزار روپے ماہوار کے حساب سے تین ماہ کے لئے کرایہ پر دیئے۔ عقدِ اجارہ کے تام ہونے کے بعد بشیر مستاجر نے خالد موجر سے کہا کہ میں اپنی رضائے تام سے بجائے پانچ کے ساڑھے پانچ ہزار روپے کرایہ دوں گا۔

حکم: قانونِ مذکور کی روشنی میں یہ صورت بھی جائز ہے اور بشیر مستاجر کا یہ اضافہ نافذ و لازم ہوگا۔

(۶) خالد نے اپنے مکان کے تین کمرے بشیر کو پانچ ہزار روپے ماہوار کے حساب سے تین ماہ کے لئے کرایہ پر دیئے۔عقدِ اجارہ کے تام ہونے کے بعد خالد موجر نے بشیر مستاجر کو کہا کہ کرایہ بجائے پانچ کے ساڑھے پانچ ہزار ہوگا یا کہا کہ بجائے تین کے دو کمرے استعمال کرنے دوں گا، یا بشیر مستاجر نے کہا کہ بجائے پانچ ہزار کے ساڑھے چار ہزار کرایہ ہوگا۔

حکم: قانونِ سابق کی رو سے بعد العقد خالد کا کرایہ میں اضافہ یا شیءموجَر میں کمی، یا بشیر مستاجر کا کرایہ میں کمی کرنا، خلافِ شرع اور ناجائز ہے۔

(۷) زید نے بکر کو ایک سال کے لئے مکان ماہوار چھ ہزار روپے کرایہ کے حساب سے دیا اور یہ شرط لگائی کہ مجھے عقد تام ہونے کے بعد بھی اجرت میں کمی کا اختیار ہوگا۔

حکم: قانونِ سابق کے پیشِ نظر یہ شرط خلافِ شرع نہیں، لہٰذا یہ عقدِ اجارہ صحیح ہے اور زید موجِر جب چاہے کرایہ میں کمی کر سکتا ہے۔

(۸) زید نے بکر کو ایک سال کے لئے مکان ماہوار چھ ہزار روپے کرایہ کے حساب سے دیا، اور یہ شرط لگائی کہ عقد کے مکمل ہونے کے بعد تیسرے مہینے سے مجھے اجرت میں ایک ہزار روپے تک اضافے اور زیادتی کا اختیار ہوگا۔

حکم: قانونِ سابق کے پیشِ نظر یہ شرط خلافِ شرع ہے لہٰذا یہ عقدِ اجارہ فاسد ہے۔

(۹) زید نے بکر کو ایک سال کے لئے مکان ماہوار چھ ہزار روپے کرایہ کے حساب سے دیا اور بکر مستاجر نے یہ شرط لگائی کہ تمامِ عقد کے بعد مجھے اجرت میں اضافہ کا اختیار ہوگا۔

حکم: قانونِ سابق کے مطابق یہ شریعت کے موافق اور جائز ہے۔

(۱۰) زید نے بکر کو ایک سال کے لئے مکان ماہوار چھ ہزار روپے کرایہ کے حساب سے دیا، اور بکر مستاجر نے بوقت عقد یہ شرط لگائی کہ تمامِ عقد کے بعد تیسرے مہینے سے مجھے اجرت میں ایک ہزار تک کمی کا اختیار ہوگا۔

حکم: قانونِ سابق کی رو سے یہ شرط خلافِ شرع اور ناجائز ہے، لہٰذا اس شرطِ فاسد کی وجہ سے اجارہ فاسد ہوگا۔

(۱۱) زید نے اپنا گھر بکر کو اس طرح کرایہ پر دیا کہ تین ماہ کا تو عقدِ اجارہ کرلیا اور ہر ماہ پانچ ہزار روپے اجرت طے ہوئی، اور معاہدہ ایک سال کا کیا، لیکن یہ شرط لگائی کہ تین ماہ کے بعد جدید عقد ایک ہزار تک اضافے کے ساتھ ہوگا۔ اور بکر نے قبول کرلیا۔

حکم: اس صورت کا حکم یہ ہے کہ تین ماہ کا عقد اس معاہدے اور شرط کی وجہ سے فاسد نہ ہوگا۔ اور جدید اجارے میں جانبین کو عقد کرنے اور نہ کرنے کا اختیار ہوگا، کوئی دوسرے پر جبر نہیں کرسکتا۔ البتہ معاہدہ پورا کرنے کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ معاہدے کے مطابق جدید عقد کرلیا جائے۔

(۱۲) زید نے مکان ایک سال کے لئے کرایہ پر بکر کو اس طرح دیا کہ شروع کے تین ماہ کا کرایہ چار ہزار ہوگا، پھر تین ماہ کا کرایہ چار ہزار ہوگا، پھر تین ماہ کا کرایہ پانچ ہزار ہوگا اور پھر آخر کے تین ماہ کا کرایہ چھ ہزار ہوگا۔

حکم: یہ صورت جائز ہے۔ اور اجارہ پورے سال کا منعقد ہوا، کسی کو انکار اور خلاف کرنا جائز نہیں۔

و قال العلامة الحصكفى رحمه الله تعالىٰ : (استأجر عبدا شهرين : شهرا بأربعة . و شهرا بخمسة صح) على الترتيب المذكور، حتى لو عمل فى الأول فقط فله أربعة و بعكسه خمسة .(الشامية ۹ /۱۲۵ ط رشيدية)

اجارۂ بنوکیہ کی صورتیں کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی تحریرات کی روشنی میں:

(۱) مشینری مثلاً پانچ سال کی مدت تک مکمل عقد کر کے اس طرح کرایہ پر دی کہ پہلے سال کا کرایہ مثلاً ایک لاکھ ہوگا، دوسرے کا ڈیڑھ لاکھ، تیسرے کا دو لاکھ، چوتھے کا ڈھائی لاکھ اور پانچویں کا تین لاکھ۔ اور مستاجر نے قبول کرلیا۔

اس صورت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''اب اس اضافے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ شروع ہی میں ہر سال کی اجرت طے کرلی جائے۔ بعض اجاروں میں ایسا ہی ہوتا ہے''۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۲۶۶)

تبصرہ: یہ صورت جائز ہے، اس میں اجارہ کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں۔

(۲) مشینری مثلاً پانچ سال کی مدت تک مکمل عقد کر کے اس طرح کرایہ پر دی کہ پہلے سال کا کرایہ تو ایک لاکھ روپیہ متعین طور پر ہوگا، اس کے بعد والے سالوں میں بینک کو پندرہ فی صد یا پچیس ہزار تک اضافے کا اختیار ہوگا۔ اس صورت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

''دوسری صورت یہ ہے کہ ہر سال اجرت میں دس یا پندرہ فی صد اضافہ کرنا طے کرلیا جائے۔ بڑے تجارتی ادارے اگر بینک سے کوئی مشینری وغیرہ اجارے پر لیتے ہیں تو اس میں بنیادی طور پر یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلی مدتِ اجارہ کا تعین تو ایک لگی بندھی رقم سے ہوجاتا ہے اس کے بعد اجرت کو کسی معیار (benchmark) سے منسلک کیا جاتا ہے اور یہ درست ہے کہ یہ معیار وہ شرح سود و شرح منافع ہوتی ہے جس پر بینک آپس میں لین دین کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی عقد میں یہ مذکور ہوتا ہے کہ اگر یہ شرح ابتدائی اجرت سے پندرہ فی صد زیادہ بڑھ گئی تو اضافہ پندرہ فی صد سے زیادہ نہیں ہوگا''۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۲۶۶)

تبصرہ: یہ صورت قانونِ سابق کے خلاف اور صورت نمبر (۸) کی طرح خلاف شرع، ناجائز اور مفسدِ عقد اجارہ ہے۔

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی تاویل اور اس کا بطلان:

اس دوسری صورت کو ہماری پیش کردہ صورت نمبر (۷) جس میں اجرت متعین ہے اور موجر نے اپنے لئے اجرت میں کمی کی شرط لگائی ہے، پر قیاس کرتے ہوئے اس کو جائز کہا گیا ہے۔ حالانکہ یہ صورت مندرجہ بالا صورتوں میں سے صورت نمبر (۸) کی طرح ہے جس میں اجرت متعین کرنے کے بعد موجر نے اپنے لئے اضافے کی شرط لگوائی ہے اور یہ صورت قانونِ اجارہ کے خلاف اور باطل ہے اور اس قسم کی شرط کی وجہ سے ایسے تمام اجارے فاسد ہیں۔

تاویل کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

> ''اس طریق کار پر دو اعتراض کئے گئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس طریق کار میں اجرت مجہول ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر یہ کہا جاتا کہ ہر سال کرائے میں پندرہ فی صد اضافہ ہوگا تو یہ جائز ہوتا یا نہیں؟ (**بے شک جائز ہوتا۔ کیونکہ اجرت متعین ہوگئی اور مستاجر نے قبول بھی کیا، احمد ممتاز**) ظاہر ہے کہ اس سے اجرت مجہول نہیں ہوتی، اور یہ طریقہ نہ صرف جائز ہے بلکہ اکثر کرایہ داریوں میں فی صد اضافہ کا عام رواج ہے۔ جب یہ جائز ہے تو اس کے ساتھ یہ شرط لگا لینا کہ کسی خاص معیار کے مطابق یہ اجرت پندرہ فی صد سے کم بھی ہوسکتی ہے، بطریق اولی جائز ہوگا''۔ (غیر سودی بینکاری، ص:۲۶۶)

تبصرہ: یہ اس وقت ہوتا کہ بوقتِ عقد پندرہ فی صد زیادتی کے ساتھ اجرت متعین کر کے مستاجر کو یہ بتایا جائے کہ اصل اجرت آپ کے ذمہ یہ ہے اور مستاجر اس کو قبول کرلے پھر بینک اپنے لئے کمی کی شرط لگا دے، جبکہ یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اجرت بوقتِ عقد پندرہ فی صد اضافے کے بغیر فریقین کے مابین متعین ہوتی ہے، اور بینک اس متعین اجرت پر اپنے لئے اضافے کی شرط لگا رہا ہے، اور یہ قانونِ اجارہ کے خلاف، اور اجرت کے مجہول

ہونے کی وجہ سے مفسدِ عقد ہے۔

اس عبارت سے یہ تأثر دیا جارہا ہے کہ گویا پہلے اجرت زیادہ تھی اور اب ہم اس کو کم کر رہے ہیں، حالانکہ یہ تأثر خود کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی تصریح کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ ''کتاب'' میں ہے:

''البتہ بڑے تجارتی اداروں کو جو مشینری وغیرہ کرایہ پر دی جاتی ہیں اس میں پہلی مدت کا کرایہ تو لگی بندھی رقم کی صورت میں متعین ہوتا ہے، لیکن بعد کی مدتوں میں اس میں ایک خاص تناسب سے اضافہ ہوتا رہتا ہے'' (غیر سودی بینکاری، ص:۲۶۵)

لہٰذا اجرت میں اضافے کی شرط کے جواز کی کوئی عبارت اور دلیل بیان کی جائے۔ کمی کے جواز کی دلیل اور عبارت اس موقع پر نہ تو سودمند ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے۔

ایک تاویل اور اس کا بطلان:

بعض لوگ اس کی ایسی تاویل کرتے ہیں جو'' **تأویل القول بما لا یرضی به قائله** '' کے قبیل سے معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اصل میں بیع ڈالر میں ہوتی ہے، جس کی قیمت کی کمی بیشی کا اثر پاکستانی کرنسی پر پڑنا لازم ہے، اور یہ کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔

تبصرہ: یہ تاویل دو وجہوں سے درست نہیں۔

(۱) کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں تحریر ہے کہ اضافہ پندرہ فی صد تک ہوگا (کما مر آنفا)...... اگر ڈالر پر معاملہ ہوتا تو اس میں دس یا پندرہ فی صد وغیرہ کا اعتبار نہ ہوتا۔

(۲) ڈالر کی قیمت گر جانے کی صورت میں اس کے مطابق پاکستانی روپے کم لئے جانے چاہئیں۔ جبکہ اس کی طرف نہ تو ''کتاب'' میں اشارۃً ذکر ہے اور نہ ہی آج تک سنا گیا ہے کہ بینکوں نے ڈالر کی قیمت میں کمی کی صورت میں اس کے مطابق کسی سے پاکستانی روپے کم وصول کیے ہوں۔

﴿خلافِ شرع امر نمبر۴: لزومِ التزامِ تصدقِ مال کا حکم﴾

قانونِ التزامِ تصدق:

(۱) یہ نذر ہے جو دیانۃً واجب ہے۔ مخلوق میں کسی کے لیے نذر اور منت ماننے والے سے نذر پوری کرنے کے مطالبہ کا نہ حق ہے اور نہ جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ : (لزم النذر) أی لزمه الوفاء به و المراد أنه يلزمه الوفاء بأصل القربة التی التزمها لا بكل وصف التزمه لأنه لو عين درهما أو فقيرا أو مكانا للتصدق أو للصلوة فالتعيين ليس بلازم ، بحر ، و تحقيقه فی الفتح . (الشامية ۵ /۵۳۸، ط:رشيديه)

قال العلامة الخوارزمی رحمه الله تعالیٰ : (قوله : لأنه لا مطالب له فی الدنيا فلا يطالب به فيها) و ذلک لأنه أوجب عليه حكما يطالب به فی الآخرة و لا يظهر أثره فی الدنيا من حيث الالزام فلو أوجبنا عليه الضمان لأخذه الحاكم و حبسه فيه فيكون زائدا علی ما أوجبه و هذا لا يجوز .

(الكفاية علی هامش الفتح ۸/ ۱۸۱ ، ۱۸۲ ، و راجع له أيضا "مبسوط السرخسی" ۲۴ / ۱۲۲)

(۲) بدوں نذر، وعدہ وغیرہ کے طور پر کوئی اپنے اوپر کسی چیز کو واجب کر دے۔ اس کے لیے قانون یہ ہے کہ اگر طیبِ خاطر سے واجب کیا ہے تو یہ واجب بھی ہے اور اداء کرنا بھی لازم ہے اور بدوں طیبِ خاطر کسی کے جبر واکراہ سے واجب کیا ہے تو اس کے ذمہ نہ واجب ہے اور نہ کسی کے لیے اس سے مطالبہ کرنا اور لینا جائز اور حلال ہے۔

قال الامام السرخسی رحمه الله تعالیٰ: ولو أكره بوعيد قتل أو حبس حتی تزوج امرأة علی عشرة آلاف درهم ومهر مثلها ألف درهم جاز النكاح لما بينا أن الجد والهزل فی النكاح والطلاق والعتاق سواء فكذلک الإكراه

والطواعية وللمرأة مقدار مهر مثلها **لأن التزام المال يعتمد تمام الرضا ويختلف بالجد والهزل فيختلف أيضا بالإكراه والطوع فلا يصح من الزوج التزام المال مكرها** إلا أن مقدار مهر المثل يجب لصحة النكاح لا محالة.

(المبسوط للسرخسي ۲۴/۷۵، و نحوه فی البدائع)

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی عبارت پر تبصرہ:

''کتاب'' میں تحریر ہے:

''صدقہ کا معلق وعدہ ایک طرح کی نذر ہے، اس لئے وہ خود حنفی اصول کے تحت لازم ہے، لیکن اگر بالفرض وہ اس قاعدے میں داخل نہ بھی ہوتو صاحبِ اشباہ کے قول کے مطابق محلِ نظر قرار پا کر مسکوت عنہ ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کسی اور مذہب سے کوئی قول لے لیا جائے تو اس کو خروج عن المذہب نہیں کہا جائے گا۔'' (غیر سودی بینکاری: ۲۸۳)

تبصرہ: اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ التزامِ تصدق کے وعدہ کے وجوب کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں:

(۱) نذر۔

(۲) غیر نذر، جس کا وجوب کسی اور مذہب سے لیا گیا ہے۔

پہلی وجہ: یعنی نذر سے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ بات مسلم ہے کہ نذر کوئی خوشی سے مانے یا ناخوشی سے ہر صورت میں لازم اور واجب ہے، اگر چہ ناخوشی کی صورت میں مکرِہ اور زبردستی کرنے والا کسی درجہ میں گناہ گار ضرور ہوگا، یہاں تک تو اتفاق ہے، لیکن نذر کا حکم جو صراحۃً حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا ہے، بینک میں اس کے خلاف ہو رہا ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نذر کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نذرِ مطلق

(۲) نذرِ معلق، پھر نذرِ معلق کی دوصورتیں ہیں: ''نذر معلق بشرط یُرَادُ کَوْنُہ''

اور'' نذر معلق بشرط لایُرَادُ کَوْنُہ''۔

نذرِ مطلق: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص بغیر کسی شرط اور تعلیق کے کوئی چیز اپنے اوپر لازم کرلے۔

نذرِ معلق: اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شرط اور تعلیق کے ساتھ اپنے اوپر کوئی چیز لازم کرلے۔ پھر اس کی دوصورتیں ہیں اور ہر ایک کا حکم الگ ہے۔

''نذر معلق بشرط یُرَادُ کَوْنُہ'': یہ ہے جس میں نذر ماننے والا شرط کے وقوع اور ہونے کا ارادہ رکھتا ہے یعنی وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرط اور تعلیق کے مطابق معاملہ فرمائیں مثلاً اگر میرے مریض کو شفا ہوئی تو اتنا صدقہ کروں گا، یا میرا فلاں گمشدہ بھائی لوٹ آیا تو اس قدر صدقہ کرونگا۔

حکم: نذرِ مطلق اور نذرِ معلق بشرط یراد کونہ دونوں کا حکم ایک ہے کہ نذر ماننے والے کے ذمہ منذور شیء یا اس کی قیمت دیانۃً واجب ہے یعنی وجوب اور لزوم بین اللہ و بین العبد ہوتا ہے، اور عدمِ ادا کی صورت میں اس کا مواخذہ صرف آخرت میں ہوسکتا ہے، دنیا میں کسی کو اس کے مواخذہ کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس حکم کا حاصل یہ ہے کہ وجوب کے بعد یہ شخص ادا میں آزاد ہے جب چاہے ادا کرے۔

''نذر معلق بشرط لا یُرَادُ کَوْنُہ'': اس کا مطلب یہ ہے کہ نذر ماننے والا شرط کے وقوع اور ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا بلکہ ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو روکنے کے لئے نذر مانتا ہے یعنی جس چیز کو وہ بطور شرط کے ذکر کرتا ہے اس کے ہونے کو نہیں چاہتا بلکہ نہ ہونے کو چاہتا ہے مثلاً کوئی یوں کہے کہ اگر میں نے زنا کیا تو اتنے روزے رکھوں گا یا

اتنا روپیہ صدقہ کروں گا۔

حکم: راجح قول کے مطابق اس صورت میں نذر ماننے والے کو نذر اور کفارۂ یمین میں اختیار ہے، یعنی چاہے تو اپنی نذر پوری کرے یا قسم کا کفارہ ادا کرے۔

نذر کی اس تفصیل کے بعد بینک کے اس نظام پر غور کیا جائے کہ یہ نذر کی کس قسم میں داخل ہے۔غور کرنے سے بآسانی یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ بینک کا یہ لزومِ التزام "**نذر معلق بشرط لا یُرَادُ کَوْنُہ**" میں داخل ہے، کیونکہ بینک عدمِ ادائیگی اور تاخیرِ قسط و کرایہ کی وجہ سے یہ التزام کرواتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں ایسی شرطیں ہیں جن کے وقوع اور ہونے کو ملتزِم (التزام کرنے والا) نہیں چاہتا۔ لہٰذا شرعاً مشتری اور مستأجِر (کلائنٹ) کے ذمے بعینہ یہ نذر پوری کرنا ضروری نہیں، بلکہ اس کو اختیار ہے کہ بجائے ادائے نذر قسم کا کفارہ دے کر بری الذمہ ہوجائے۔ جبکہ بینک اس کو نذر ہی پر مجبور کرتا ہے اور بینک کا یہ مجبور کرنا خلاف شرع اور ناجائز ہے۔

نیز اگر کوئی اس نذر کو **نذرِ معلق بشرط یراد کونہ** میں داخل کرنے پر بضد ہے تو بنا بر تسلیم عرض یہ ہے کہ بینک میں نذر کی اس قسم کے حکم کی بھی مخالفت ہورہی ہے کیونکہ اس قسم میں مطالبہ صرف دیانۃً ہے مخلوق میں سے کسی کو جائز نہیں کہ اس سے اداء کا مطالبہ کرے، نیز اس میں فقیر، مکان اور وقت کی تعیین اگرچہ ناذر کر بھی لے تو بھی اس کی پابندی شرعاً اس کے ذمے لازم نہیں، بلکہ شریعت نے ان سب امور میں اس کو آزادی اور اختیار دیا ہے، جبکہ بینک نے اس کی اس آزادی کو سلب کیا ہے۔ بینک کے پاس جمع نہ کرنے کی صورت میں بینک اس کا مواخذہ کرتا ہے، اور اس کے صوابدید کے بجائے بینک اپنے صوابدید پر خرچ کرتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں شرعاً درست نہیں، ان کے ثبوت اور جواز کے

لئے حوالہ درکار ہے۔

قال الامام المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : (و من نذر نذرا مطلقا فعليه الوفاء) لقوله ﷺ : من نذر و سمى فعليه الوفاء بما سمى .

(الهداية ۲/ ۴۸۰ ط : رحمانيه)

قال في التنوير و شرحه : ثم ان المعلق فيه تفصيل فان (علقه بشرط يريده كأن قدم غائبى) أو شفى مريضى (يوفى) وجوبا (ان وجد) الشرط (و) ان علقه (بما لم يرده كان زنيت بفلانة) مثلا فحنث (وفى) بنذره (أو كفر) يمينه (على المذهب) لأنه نذر بظاهره ، يمين بمعناه فيتخير ضرورة.

و قال العلامة الشامى رحمه الله تعالىٰ :(قوله : ثم ان المعلق الخ) : اعلم أن المذكور فى كتب ظاهر الرواية أن المعلق يجب الوفاء به مطلقا: أى سواء كان الشرط مما يراد كونه: أى يطلب حصوله كإن شفى الله مريضى أو لا كإن كلمت زيدا أو دخلت الدار فكذا وهو المسمى عند الشافعية نذر اللجاج وروى عن أبى حنيفة التفصيل المذكور هنا وأنه راجع إليه قبل موته بسبعة أيام وفى الهداية: إنه قول محمد وهو الصحيح اهـ ومشى عليه أصحاب المتون كالمختار والمجمع ومختصر النقاية والملتقى وغيرها وهو مذهب الشافعى وذكر فى الفتح أنه المروى فى النوادر وأنه مختار المحققين.(الشامية ۵ / ۵۴۲ ط : رشيديه)

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (لزم النذر) أى لزمه الوفاء به و المراد أنه يلزمه الوفاء بأصل القربة التى التزمها لا بكل وصف التزمه لأنه لو عين درهما أو فقيرا أو مكانا للتصدق أو للصلوة فالتعيين ليس بلازم ، بحر، و تحقيقه فى الفتح .(الشامية ۵ /۵۳۸،ط:رشيديه)

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ (نذر لازم ہے) یعنی اس کو پورا کرنا لازم ہے اور مراد یہ ہے کہ اس کے ذمہ اس اصل نیکی (عبادت) کا پورا کرنا لازم ہے جس کو اس نے اپنے اوپر لازم کیا ہے نہ کہ ہر اس وصف کے ساتھ جس کا اس نے التزام کیا اس لئے کہ اگر اس نے صدقہ کرنے کے لئے کسی درہم یا کسی فقیر یا پھر کسی جگہ کو صدقہ کرنے یا نماز پڑھنے کے لئے متعین کر دیا تو یہ تعین اس پر لازم نہیں ہے اور اس مسئلے کی پوری تحقیق فتح القدیر میں ہے۔

قال الامام المرغینانی رحمه الله تعالیٰ : و النذر لا یعمل فیه الاکراه لأنه لا یحتمل الفسخ و لا رجوع للمکرَه بما لزمه لأنه لا مطالب له فی الدنیا فلا یطالب به فیها الخ

علامہ مرغینانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نذر میں اکراہ جاری نہیں ہوتا اس لئے کہ نذر فسخ کا احتمال نہیں رکھتی اور مکرَہ (جس پر زبردستی کی گئی ہے) کو یہ حق حاصل نہیں کہ جو چیز (نذر کی وجہ سے) اس پر لازم ہوئی ہے اس کا مکرِہ (زبردستی کرنے والے) سے رجوع (مطالبہ) کرے اس لئے کہ دنیا میں اس (نذر کے پورا کرانے) کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہیں ہے، لہٰذا دنیا میں اس کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

وقال العلامة الخوارزمی رحمه الله تعالیٰ : (قوله : و النذر لا یعمل فیه الاکراه) حتی لو أکره بوعید تلف علی أن یوجب علی نفسه صدقة أو صوما أو حجا ماشیا یتقرب به الی الله تعالیٰ ففعل لزمه ذلک و کذا ان أکرهه علی الیمین بشیء من ذلک أو بغیره لأن النذر مما لا یلحقه الفسخ لأنه یمین لقوله علیه السلام ((النذر یمین)) و هی مما لا یحتمل الفسخ و ما لا یؤثر فیه الفسخ بعد وقوعه لا یؤثر فیه الاکراه من حیث الصحة کالعتاق و هذا لأن أثر الاکراه فی فوات الرضا و أثره فی عدم اللزوم و أثره فی حق الفسخ فما لا یحتمل الفسخ لا یتأتی فیه أثر الاکراه فلا یؤثر فیه الاکراه ،

(قولہ : لأنہ لا مطالب لہ فی الدنیا فلا یطالب بہ فیھا) و ذلک لأنہ أوجب علیہ حکما یطالب بہ فی الآخرۃ و لا یظھر أثرہ فی الدنیا من حیث الالزام فلو أوجبنا علیہ الضمان لأخذہ الحاکم و حبسہ فیہ فیکون زائدا علی ما أوجبہ و ھذا لا یجوز.

(الکفایۃ علی ھامش الفتح ۸/ ۱۸۱ ، ۱۸۲، و راجع لہ أیضا "مبسوط السرخسی" ۲۴ / ۱۲۲)

علامہ خورازمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں صاحبِ ہدایہ کے اس قول کے بارے میں کہ (اور نذر میں اکراہ جاری نہیں ہوتا) یہاں تک کہ اگر کسی کو دھمکی دے کر مجبور کر دیا جائے کہ وہ اپنے اوپر کچھ صدقہ یا روزہ یا پیدل حج لازم کرے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب مقصود ہو تو اس پر اب یہ نذر لازم ہے اور اگر کسی کو ان مذکورہ اشیاء یا کسی اور چیز کے بارے میں قسم پر مجبور کر دیا جائے تو اس کا بھی یہی حکم ہے اس لئے کہ نذر ان چیزوں میں سے ہے جو فسخ نہیں ہوسکتیں، نبی کریم ﷺ کے اس قول "نذر یمین ہے" کے مطابق کہ نذر ایک قسم ہے، اور یمین ان چیزوں میں سے ہے جو فسخ کا احتمال نہیں رکھتی اور جو اشیاء ایک بار واقع ہو جانے کے بعد فسخ نہ ہوسکتیں تو ان میں صحت کے اعتبار سے اکراہ بھی مؤثر نہیں ہوتا، جیسا کہ "کسی غلام کو آزاد کرنا" اور یہ اس وجہ سے کہ اکراہ کا اثر رضا مندی کے فوت ہونے میں ہے اور عدمِ رضا کا اثر لازم نہ ہونے میں ہے اور حقِ فسخ میں ہے تو جو اشیاء فسخ کا احتمال ہی نہیں رکھتیں، ان میں اکراہ کا اثر بھی جاری نہیں ہوگا اور ان میں اکراہ مؤثر نہیں ہوگا۔ صاحبِ ہدایہ کا یہ قول کہ (دنیا میں کوئی اس کا مطالب نہیں تو دنیا میں اس کا مطالبہ بھی نہیں ہوگا) یہ اس وجہ سے کہ نذر ماننے والے نے اپنے اوپر ایسے حکم کو واجب کیا ہے جس کا اس سے آخرت میں مطالبہ کیا جائے گا اور دنیا میں لازم کرنے کے اعتبار سے اسکا اثر ظاہر نہیں ہوسکتا، لہٰذا ہم اگر مکرہ پر ضمان کو لازم کر دیں تو حاکم اس سے ضمان لے گا اور اس کو قید بھی کرے گا۔ تو نذر ماننے والے نے جو اپنے اوپر لازم کیا

ہے یہ اس سے زائد ہو جائے گا، جو کہ جائز نہیں۔

'کتاب'' میں اس بحث کے آخر میں ہے:

''رہی یہ بات کہ صدقہ اختیاری ہوتا ہے اور اسے لازم کر کے جبری بنا دیا گیا ہے، تو اس کے بارے میں عرض یہ ہے کہ ہر نذر کا یہی حال ہوتا ہے کہ اس سے اختیاری عبادت واجب اور لازم ہو جاتی ہے۔'' (غیر سودی بینکاری، ص: ۲۹۷)

تبصرہ: ایک آدمی اپنے اختیار سے فقیر کے لئے نذر مانتا ہے کہ میرے ذمہ فلاں فقیر کو دس ہزار روپیہ کا صدقہ دینا لازم ہے اور دوسرا آدمی کسی بدمعاش کے ڈنڈے اور دھمکانے سے کسی فقیر کے لئے دس ہزار روپیہ صدقہ کی نذر مانتا ہے کیا ان دونوں میں فرق نہیں؟ پہلی قسم میں اختیاری صدقہ کو اپنے اختیار اور خوشی سے لازم کر رہا ہے اور دوسری صورت میں اختیاری صدقہ کو بدمعاش کے ڈر سے بدوں خوشی، رضائے تام کے لازم کرتا ہے ...... الحاصل ہر نذر میں اختیاری عبادت ناذر کی رضائے تام اور خوشی سے لازم ہوتی ہے اور بینک میں اختیاری عبادت رضائے تام اور دل کی خوشی سے نہیں بلکہ دباؤ سے لازم ہوتی ہے، اگرچہ دباؤ سے بھی شرعاً نذر لازم ہو جاتی ہے (کما مر فی عبارۃ الکفایۃ) لیکن کیا یہ دباؤ ڈالنا اور اس کے ذمہ نذر لازم کرنا جائز ہے؟

دوسری وجہ: یعنی غیر نذر جس کا وجوب مالکی مذہب سے لیا گیا ہے، سے متعلق درج ذیل گذارشات ہیں:

اولاً: یہ عرض ہے کہ یہ ان کے مذہب میں بھی نذر ہے، ان کے مذہب کی جو عبارت نقل فرمائی گئی ہے اس کے بعض اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

و أما اذا التزم أنه ان لم يؤف حقه فى وقت كذا، فعليه كذا و كذا لفلان، أو صدقة للمساكين، .... اذا قلنا: ان الالتزام المعلق على فعل الملتزم

الذی علی وجه الیمین لا یقضی به علی المشهور،

دونوں عبارتوں میں تعلیق ہے، اور تعلیق نذر کی ایک صورت ہے۔اور دوسری عبارت میں ”علی وجه الیمین“ کی تصریح ہے اور یمین بالشیٔ نذر ہی ہے۔

کما صرح به فی الکفایة : و کذا ان أکرهه علی الیمین بشیء من ذلک أو بغیره لأن النذر مما لا یلحقه الفسخ لأنه یمین لقوله علیه السلام ((النذر یمین)) . (الکفایة علی هامش الفتح ۸ / ۱۸۱ ، ۱۸۲)

جب اس کا نذر ہونا مذہب مالکی میں ثابت ہوا تو اس پر نذر کے احکام جاری ہوں گے اور نذر کے احکام فقہ حنفی میں موجود ہیں، لہٰذا فقہ حنفی کو چھوڑ کر فقہ مالکی کی طرف جانا خروج عن المذہب نہیں تو اور کیا ہے؟

ثانیاً: اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ التزامِ تصدق کا وعدہ نذر نہیں اور مذہبِ مالکیہ میں بھی اس التزام کو نذر نہیں کہا گیا تو بھی یہ خروج عن المذہب ہے، کیونکہ بینک نے ”التزامِ تصدقِ مال“ کو مشتری اور مستاجر پر جبراً لازم کیا ہے کہ وقت پر عدمِ ادائیگی کی صورت میں چندہ فنڈ میں چندہ دینا ضروری ہے اگرچہ اس کی طیبِ خاطر اور رضائے تام نہ ہو، اور بدوں طیبِ خاطر اور رضائے تام کسی سے چندہ وصول کرنے کا حکم قرآن کریم و احادیث مبارکہ اور فقہ حنفی بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی صراحۃً موجود ہے کہ اس طرح چندہ وصول کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بھی مالداروں سے بدوں طیبِ خاطر چندہ وصول کرنے کو ناجائز فرماتے ہیں:

”آج کل ایک عام دستور یہ ہو گیا ہے کہ اہلِ خیر کو کسی بہانے سے کہیں جمع کر کے ان سے رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، یہ طریقہ انفرادی طور پر کسی سے سوال کرنے کی بنسبت بھی

زیادہ قبیح ہے اس صورت میں مجمع میں رسوائی سے بچنے کے لئے بادلِ نخواستہ چندہ دینا پڑتا ہے جو بلاشبہ جبر ہے اس لئے یہ طریقہ بالکل ناجائز اور حرام ہے۔‘‘

(رسالہ ’’صیانۃ العلماء‘‘ احسن الفتاوی، ۱/ ۴۳۷)

قرآن کریم کی متعدد آیات میں کسی کا مال اس کی دلی رضا اور خوشی کے بغیر ناحق اور باطل طریقہ پر کھانے کی حرمت صراحۃً مذکور ہے۔

﴿و لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل﴾ [البقرة:۱۸۸]

﴿يا أيها الذين أمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل الا أن تكون تجارة عن تراض منكم﴾ [النساء: ۲۹]

اور حدیث میں صریح الفاظ میں ’’ألا لا تظلموا، ألا لا يحل مال امرء الا بطيب نفس منه ‘‘(المشكوة : ۲۵۵) کہ طیب نفس یعنی دل کی خوشی کے بغیر کسی کا مال حلال نہیں۔

اور فقہ میں ایسی متعدد جزئیات ہیں جن میں حلت کا مدار طیب نفس اور دلی رضا کو بنایا ہے اور جہاں دلی خوشی نہیں ہوتی وہاں حرمت کا حکم لگایا گیا ہے۔ مثلاً عورت کے مہر کو اس کی اجازت سے والد کے لئے استعمال جائز ہے لیکن صرف زبانی اجازت نہیں بلکہ دل سے بھی راضی ہو۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: قوله: (و صح حطها) الحط: الاسقاط كما فى المغرب، و قيد بحطها ؛ لأن حط أبيها غير صحيح لو صغيرة، و لو كبيرة توقف على اجازتها، و لا بد من رضاها.

ففى هبة الخلاصة: خوفها بالضرب حتى وهبت مهرها لم يصح لو قادرا على الضرب اهـ .(رد المحتار ۴/۲۳۹، ط:رشيديه)

یہاں پر ہبہ اپنے اختیار سے ہے پھر صحیح کیوں نہیں؟ اس لئے کہ جبر و اکراہ کی وجہ سے

طیبِ نفس اور دل کی خوشی نہیں رہی۔

قال الامام السرخسی رحمه الله تعالیٰ: ولو أكره بوعيد قتل أو حبس حتى تزوج امرأة على عشرة آلاف درهم ومهر مثلها ألف درهم جاز النكاح لما بينا أن الجد والهزل فى النكاح والطلاق والعتاق سواء فكذلك الإكراه والطواعية وللمرأة مقدار مهر مثلها **لأن التزام المال يعتمد تمام الرضا ويختلف بالجد والهزل فيختلف أيضا بالإكراه والطوع فلا يصح من الزوج التزام المال مكرها** إلا أن مقدار مهر المثل يجب لصحة النكاح لا محالة.

(المبسوط للسرخسی ۲۴/۷۵، و نحوه فى البدائع)

اس عبارت میں تصریح ہے کہ رضائے تام کے بغیر نکاح کے ذریعے شوہر سے جتنے حصے کا زبردستی التزامِ مال کرایا جاتا ہے، وہ شرعاً واجب ہی نہیں، لہٰذا بدوں طیب خاطر اس کی بیوی کے لئے یہ مال حلال نہیں۔ اسی طرح عقد مرابحہ و اجارہ کے وقت بینک کے خود ساختہ اور من گھڑت قوانین کے ذریعہ مشتری اور مستاجر سے جو التزامِ تصدقِ مال کرایا جاتا ہے، واضح ہے کہ اس میں بھی رضائے تام نہیں ہوتی لہٰذا یہ تصدقِ مال نہ تو شرعاً لازم ہوگا اور نہ ہی مشتری اور مستاجر کی طیب خاطر کے بغیر کسی کے لئے اس کا کھانا اور استعمال کرنا حلال اور جائز ہوگا۔

دیکھیے! علامہ سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے التزامِ مال کے لئے رضائے تام کی شرط لگا کر التزامِ مال کی دو قسمیں بنائی ہیں، ایک وہ التزامِ مال جو رضائے تام کے ساتھ ہو جیسے مثلاً خوشی سے کوئی چندہ دینے کا معلق وعدہ کرے، یا اپنی خوشی سے بیوی کے لئے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کر لے، تو یہ جائز، لازم اور واجب الاداء ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس میں رضائے تام نہ ہو جیسے مثلاً زبردستی مہر زیادہ رکھوانا، یا بینک کا مرابحہ و اجارہ میں التزامِ

تصدقِ مال کی شرط لگانا۔ چونکہ مشتری یا مستاجر یہ جانتا ہے کہ بدوں اس شرط کو تسلیم کئے مجھے ادھار نہیں ملے گا، لہٰذا وہ رضائے تام کے بغیر اس شرط کو قبول کرتا ہے، اس لئے یہ ناجائز، غیر لازم اور حرام ہوگا، اور اب تک بینکوں نے جتنے لوگوں سے اس عنوان کے تحت مال لیا ہے، سب کو واپس کرنا واجب ہوگا۔

تنبیہ: ''رضائے تام'' کی نفی اکراہ کے ساتھ خاص نہیں، لہٰذا اس کی نفی کے دوسرے اسباب بھی ہوسکتے ہیں، جیسے بعض اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ نے خطابِ خاص سے چندہ کو اس وجہ سے منع فرمایا ہے کہ اس صورت میں رضائے تام اور طیبِ خاطر کا یقین نہیں، بلکہ ظنِ غالب یہی ہے کہ مانگنے والے کی وجاہت کی وجہ سے شرما شرمی میں بدوں رضائے تام کے دیتا ہے۔

ثالثاً: مذہبِ مالکیہ کے جزئیہ سے بوجوہ متعددہ زیرِ بحث مسئلہ میں استدلال درست نہیں، جس کی تفصیل ہماری کتاب ''غیر سودی بینکاری ایک منصفانہ علمی جائزہ'' میں صفحہ:۲۰۴ پر......عنوان ''مالکیہ کے مذہب کے جوابات'' کے تحت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

التزامِ تصدقِ مال کے عنوان کے مذکور ہے:

> ''براہ کرم اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ شروع میں جب غیر سودی بینکاری کا آغاز ہوا تو اس قسم کا کوئی التزام گاہک سے نہیں لیا جاتا تھا، لیکن چونکہ مرابحہ میں جب ایک قیمت متعین ہوجائے تو بروقت ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اس قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، اس لئے لوگوں نے اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا، اور بھاری رقمیں جو واجب الاداء تھیں، ان کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر کے ادائیگی میں غیر معمولی تاخیر شروع کردی۔ واضح رہے کہ یہ صرف بینک کا نہیں، بلکہ ان ہزاروں افراد کا نقصان تھا جن کی رکھوائی ہوئی رقموں سے یہ سارے معاملات انجام پائے تھے'' ....
>
> (غیر سودی بینکاری ص ۲۷۷)

تبصرہ: اولاً: اس عبارت میں سوائے عوام الناس کی ہمدردی حاصل کرنے کے، مدعا کے کس جزء کو ثابت کیا جارہا ہے؟ اور اس پوری عبارت کے کس جزء میں دلیل بننے کی صلاحیت ہے؟

ثانیاً: ''احسن الفتاوی'' کے روئیداد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لزومِ التزامِ تصدقِ مال کی تجویز ابتداء سے رہی ہے نہ کہ بعد میں تجربہ کے بعد سامنے آئی، کیونکہ اس پر اسی مجلس میں حضرت مفتی عبدالواحد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا اس فنڈ کو بینک سے ہٹ کر کسی تیسرے فرد کے پاس رکھنے کی تجویز اور اہلِ بینک کا اس سے انکار، اس کی واضح دلیل ہے کہ یہ بعد کی ایجاد نہیں بلکہ شروع سے ہے، کیونکہ جو کسی دوسرے کے پاس رکھنے کے لئے تیار نہیں وہ سرے سے اس کے عدم اور نہ ہونے پر کیونکر تیار ہوسکتا ہے؟

احسن الفتاوی ج ۷ ص ۱۲۱ میں نکتہ نمبر ۱۸ کے حاشیہ پر حضرت مفتی عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم کی تجویز ان الفاظ میں نقل فرمائی گئی ہے:

> ''مجلس کی تجویز تو یہ ہے کہ یہ فنڈ بنک کے بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے مگر بنک اپنی ہی تحویل میں رکھنے پر مصر ہے ۱۲ ارشید''

لہٰذا کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں جو اس کے خلاف لکھا ہے وہ بہر حال ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

ثالثاً: اللہ تعالیٰ سے زیادہ رحم کرنے والا کوئی بھی نہیں، جب اللہ تعالیٰ نے دائن کے حق کے تحفظ کے لئے صرف دو ہی صورتیں بتلائی ہیں کہ شہادت و کتابت سے دائن کے حق کو تحفظ دو یا رہن کے ذریعہ اس کے حق کو محفوظ بناؤ......تو ہمیں بھی انہی دو پر اکتفاء کرنا چاہیئے اور جہاں ایسا باغی شخص ہو کہ بظاہر ان دو سے قابو نہیں آتا تو اس سے بینک معاملہ ہی نہ کرے۔

متأدبانہ مشورہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی تدابیر پر عمل کرنا چاہیئے، اس کے خلاف مذاہب اربعہ سے خروج کر کے کوئی نئی چیز ایجاد کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

التزامِ تصدقِ مال اور مجلس تحقیق مسائل حاضرہ:

''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کو اس حوالہ سے کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں قوت دی گئی ہے کہ مجلس تحقیق مسائل حاضرہ نے اسے قبول کیا اور حضرت مفتی رشید احمد قدس سرہ نے احسن الفتاوی میں نقل بھی فرما دیا ہے۔

تبصرہ: اولاً: یہ عرض ہے کہ احسن الفتاوی میں یہ نقل ایک تجاویزی رپورٹ ہے جس میں مالہ وماعلیہ کی گنجائش ہے۔

حضرت مفتی اعظم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

> ''بینک کو سود سے پاک کرنے اور ''بلا سود تجارتی ادارہ'' قائم کرنے کے نظام پر غور کرنے کے لئے شعبان ۱۴۱۲ھ میں مجلس تحقیق مسائل حاضرہ کا اجلاس دارالعلوم کراچی میں ہوا جس میں حالات حاضرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے قوانین اسلام کے تحت بحث و تمحیص کے بعد زیر نظر تجاویز تحریر کی گئیں''.................(احسن الفتاوی، ۱۱۲/۷)

اس تحریر سے دو باتیں معلوم ہو گئیں ایک یہ کہ بینک سود سے تب پاک ہوگا جب اس کو **مستقل تجارتی ادارہ** بنایا جائے۔

دوسری یہ کہ یہ صرف تجاویز ہیں ایسے حتمی فیصلے نہیں جن میں مزید غور کی گنجائش نہ ہو، اور غور کرنا اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہو۔

ثانیاً: حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس تجویز کو ان الفاظ سے ذکر فرمایا ہے:

> ''بعض علماء عصر نے اس مسئلے کے حل کے لئے یہ تجویز پیش کی، ''عمیل سے عقد مرابحہ کرتے وقت یہ لکھوا لیا جائے کہ اگر وہ ادائیگی کی اہلیت کے باوجود بروقت ادائیگی

نہ کرسکا تو وہ اپنے واجب الاداء دین کا ایک مخصوص فیصد حصہ ایک خیراتی فنڈ میں چندے کے طور پر ادا کریگا''۔ اس غرض کے لئے بینک میں ایک خیراتی فنڈ قائم کیا جائے گا جو نہ بینک کی ملکیت ہوگا اور نہ اس کی رقوم بینک کی آمدنی میں شامل ہونگی، بلکہ اس سے ناداروں کی امداد اور ان کو غیر سودی قرضے فراہم کرنے کا کام لیا جائے گا۔ بعض مالکی فقہاء کے نزدیک ایسا التزام قضاءً بھی نافذ ہوجاتا ہے''۔ (احسن الفتاوی، ۷/۱۲۰)

ان الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بطور تجویز مالکیہ کے حوالے سے یہ بات پیش کی گئی ہے، ایسا نہیں کہ اس پر گفتگو ممنوع ہو اور مخالفت اکابر کے زمرے میں داخل ہو، میرے خیال کے مطابق اس پوری عبارت میں کوئی ایسا زوردار لفظ نہیں جو اس کے حتمی فیصلہ ہونے پر صراحۃً یا اشارۃً دلالت کرے۔

ثالثاً: یہ بات مسلم ہے کہ مجلس تحقیق میں یہ تجویز پیش ہوئی لیکن اگر اس پر سیر حاصل گفتگو ہوتی اور ان اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی توجہ التزام اور لزوم التزام کے فرق کی طرف مبذول ہوتی تو یقیناً اس فرق کا اعتبار کرتے اور اس تجویز کو رد فرماتے۔

بحمد اللہ تعالیٰ بندہ کو اٹھارہ انیس سال حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں افتاء ہی کے شعبہ میں کام کرنے کی سعادت حاصل ہے کئی تحقیقی مسائل ایسے تھے جن کی تحقیق میں گویا حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ منفرد تھے اور آپ کو پوری طرح شرح صدر تھا اور کسی کے اختلاف کرنے سے بدلنے کو تیار نہ تھے لیکن بعض علماء کی مدلل تحریر سے کسی خاص مدار کی طرف توجہ دلائی گئی تو حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایسے مسائل سے بھی رجوع فرمایا۔ مثلاً شیعہ کے اہل کتاب ہونے اور مسافت سفر کا مسئلہ۔

رابعاً: خود بعض مجوزین حضرات دامت برکاتہم نے بھی حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے سالہا سال کے شاگرد ہونے کے باوجود بینک کے کئی مسائل میں حضرت مفتی

صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے اختلاف فرمایا ہے۔اس کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) بیع الوفاء سے متعلق حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے''۔(احسن الفتاوی،۶/۵۰۷)

جبکہ بعض مجوزین حضرات دامت برکاتہم شرط قبل العقد کو مفسد نہیں مانتے، بلکہ لازم مانتے ہیں اور وہ بھی قضاءً۔(غیر سودی بینکاری،ص:۲۴۸)

(۲) حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ قرض سے استیجار کے فائدے کو سود فرماتے ہیں۔ بلٹی کے مسئلہ کے تحت فرماتے ہیں:

''تو یہ اس لئے ناجائز ہے کہ وکیل قرض سے استیجار کا نفع حاصل کر رہا ہے جو سود ہے''
(احسن الفتاوی،۷/۱۷۶)

جبکہ بعض مجوزین حضرات دامت برکاتہم سیکوریٹی ڈیپازٹ جس کو انتہاءً قرض بھی مانتے ہیں پھر بھی استیجار کے نفع کو سود نہیں فرماتے ورنہ بینکوں پر پابندی عائد فرماتے۔

(۳) کرنٹ اکاؤنٹ کو حضرت مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ناجائز فرماتے ہیں۔

سوال وجواب دونوں ملاحظہ فرمایئے!

سوال:حفاظت کی غرض سے بینک میں رقم جمع کرانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب باسم ملهم الصواب

بینک میں رقم جمع کرانے کی تین صورتیں ہیں:

(۱) سودی کھاتہ (سیونگ اکاؤنٹ)

(۲) غیر سودی کھاتہ (کرنٹ اکاؤنٹ)

(۳) لاکر

(الی قولہ رحمہ اللہ تعالیٰ) کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگرچہ سود لینے کا گناہ نہیں ہے مگر تعاون علی الاثم کا گناہ اس میں بھی ہے۔

لاکر میں جمع کرانا بھی جائز نہیں، کیونکہ اس میں سود لینے اور تعاون علی الاثم کا گناہ نہیں مگر بینک کے حرام پیسے سے بنے ہوئے خانے کے استعمال کا گناہ ہے، شدید مجبوری کے وقت اس میں رقم جمع کرائی جاسکتی ہے کہ اس میں پہلی دوصورتوں کی نسبت گناہ کم ہے، لیکن پھر بھی استغفار لازم ہے (احسن الفتاوی ۱۴، ۱۵/ ۷)

جبکہ بعض مجوزین حضرات دامت برکاتہم اس کو جائز فرماتے ہیں، لکھتے ہیں:

''اگر یہ ضرورت نہ ہوتی تو کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کو جائز نہ کہا جاتا''

(غیر سودی بینکاری، ص:١٦)

''لزومِ التزامِ تصدقِ مال'' کے تحت مجلس تحقیق کا فیصلہ:

احسن الفتاوی کی عبارت اور اس کے علاوہ ایک طویل بحث لکھنے کے بعد فرمایا ہے:

''بہر کیف! یہ مسئلہ مجلس تحقیق مسائل حاضرہ میں اتفاق رائے سے طے ہوگیا تھا کہ اس مسئلہ میں ان علماء مالکیہ کا قول اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے''۔

(غیر سودی بینکاری، ص:۲۹۷)

تبصرہ: احسن الفتاوی کی عبارت سے یہ مستنبط کرنا کہ یہ اتفاق رائے سے طے ہوا تھا کسی بھی طرح درست معلوم نہیں ہوتا۔ پوری عبارت پر غور کرنے سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ ابتدائی تجویز کے طور پر لیا گیا تھا جس میں کلام اور ردوقدح کی وسیع گنجائش ہے۔ جیسے ''محدود ذمہ داری'' سے متعلق جو کچھ تحریر ہے وہ کوئی حتمی فیصلہ اور فتوی نہیں بلکہ ایک تجویز ہے جس پر بحث ومباحثہ کی گنجائش ہے۔

''کتاب غیر سودی بینکاری'' میں ہے:

''اس مسئلے کے بارے میں بندے نے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ بات بھی صاف صاف لکھی ہے کہ یہ میری طرف سے کوئی حتمی فتوی نہیں ہے بلکہ یہ ایک سوچ ہے جو اہل علم کے غور کے لئے پیش کی جارہی ہے'' (غیر سودی بینکاری ۳۳۹)

دیکھیے! یہاں دوسروں (یعنی بینک کے مالکوں اور روح رواں لوگوں) نے اس ابتدائی سوچ اور تجویز کو حتمی فیصلہ اور فتوی قرار دے کر بینکوں میں بطور قانون جاری بھی کردیا جبکہ کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں ابھی تک اس کو ایک ابتدائی سوچ ہی کہا گیا ہے۔ بعینہ اسی طرح مجلس تحقیق کی رپورٹ بھی ہے کہ یہ بھی صرف تجاویز ہیں جن میں بحث کی گنجائش ہے۔ یہ اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کا حتمی اور اتفاقی فیصلہ نہیں کہ اس کے خلاف لکھنے اور کہنے والے کو اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کا مخالف کہا جائے۔

﴿خلافِ شرع امر نمبر۵: الصفقة فی الصفقة﴾

قانونِ اجارہ وبیع:

اجارہ اور بیع کی صحت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ ایک عقد دوسرے عقد پر مشروط اور معلق نہ ہو، ورنہ یہ عقد ناجائز، فاسد اور بحکمِ ربا ہوگا۔

وقال العلامة المرغینانی رحمه الله تعالی: وكذلك لو باع عبدا على ان يستخدمه البائع شهرا او دارا على ان يسكنها ....؛ لأنه شرط لا يقتضيه العقد وفيه منفعة لأحد المتعاقدين؛ ولأنه عليه الصلاة والسلام ((نهى عن بيع وسلف))؛ ولأنه لو كان الخدمة والسكنى يقابلهما شيء من الثمن يكون إجارة فی بيع ولو كان لا يقابلهما يكون إعارة فی بيع. وقد((نهى النبی عليه الصلاة والسلام عن صفقتين فی صفقة)).

وقال الامام ابن الهمام رحمه الله تعالیٰ: فيتناول كلا من الاعتبارين

المذكورين .رواه أحمد عن أسود بن عامر عن شريک عن سماک عن عبد الرحمن بن عبد الله بن مسعود عن أبيه قال : نهى رسول اللهﷺعن صفقتين في صفقة أما ثبوته فقد رواه البزار في مسنده عن أسود بن عامر وأعل بعض طرقه ورجح وقفه وبالوقف رواه أبو نعيم وأبو عبيد القاسم بن سلام .وأما معناه ففسره المصنف بما سمعت وفسره أبو عبيد القاسم بن سلام بأن يقول الرجل للرجل أبيعک هذا نقدا بكذا ونسيئة بكذا ويفترقان عليه انتهى .ورواية ابن حبان للحديث موقوفا ((الصفقة في الصفقتين ربا)) تؤيد تفسير المصنف مع أنه أقرب تبادرا من تفسير أبي عبيد وأكثر فائدة فإن كون الثمن على تقدير النقد ألفا وعلى تقدير النسيئة ألفين ليس في معنى الربا بخلاف اشتراط نحو السكنى والخدمة.(فتح القدير ۶/۱۰۴،ط:رشيديه)

اجارہ بنوکیہ کا حکم:

چونکہ بینک جب گاڑی اجارہ پر دیتا ہے تو اس شرط کے ساتھ دیتا ہے کہ آخر میں اس گاڑی کی بیع اور خریداری بھی ضروری ہے، گویا کہ اجارہ ......بیع پر......اور...... بیع...... اجارہ پر مشروط و معلق ہے۔اس لیے یہ اجارہ فاسد، ناجائز، بحکمِ سود اور واجب الترک ہے۔

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کی عبارت پر تبصرہ:

حضرات علمائے کرام نے اجارہ بنوکیہ پر ایک اعتراض ''صفقہ فی صفقہ'' کا کیا ہے جس کا جواب کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں دیا گیا ہے، آگے یہ جواب اور اس پر تبصرہ ملاحظہ فرمایئے۔

فرماتے ہیں:

''فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے دو باتوں کے درمیان واضح فرق کیا ہے، ایک یہ کہ کوئی عقد کرتے وقت صلبِ عقد میں کوئی شرط لگا دی جائے اور دوسری صورت یہ کہ

صلبِ عقد میں تو کوئی شرط نہ ہو لیکن عقد سے ہٹ کر کوئی وعدہ کرلیا جائے۔ ذیل میں دونوں صورتوں کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل ذکر کی جاتی ہے''۔

(غیر سودی بینکاری ۲۴۲)

پہلی صورت:

فرماتے ہیں:

''صلبِ عقد میں کوئی شرط لگانا، اس کے بارے میں فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے مختلف مذاہب ہیں......حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ عام حالات میں عقد کے ساتھ کوئی شرط لگانے سے عقد فاسد ہوجاتا ہے، البتہ تین قسم کی شرطیں ہیں جو جائز ہیں اور عقد کو فاسد نہیں کرتیں، ایک وہ شرط جو مقتضائے عقد کے مطابق ہو، دوسرے وہ جو عقد کے ملائم ہو، جیسے رہن رکھنے یا کفالت یا حوالہ کی شرط، اور تیسرے وہ شرط جس پر عرف اور تعامل ہوگیا ہو۔ (غیر سودی بینکاری ۲۴۲)

آگے لکھتے ہیں:

''البتہ بعض فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے کچھ خاص صورتوں میں شرط کو جائز بھی کہا ہے، جیسے بیع الوفاء میں وفاء کی شرط اگر صلبِ عقد میں ہو تو اس کو بھی بعض فقہاء احناف رحمہم اللہ تعالیٰ نے جائز کہا ہے'' (حوالہ بالا)

تبصرہ: بیع الوفاء میں وعدۂ وفاء کی چار صورتیں ہیں۔

بیع الوفاء کی چار صورتیں مع احکام:

(۱) صلبِ عقد میں وفاء کی شرط لگائی جائے۔

(۲) عقد سے پہلے وفاء کی شرط لگائی جائے۔

(۳) جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں۔

(۴) عقد کے بعد وفاء کی شرط لگائی جائے۔

صورتِ اولیٰ کا حکم: راجح، مفتی بہ اور اکثر حنفیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ مفسدِ عقد ہے اور اس مبیع پر رہن کے سارے احکام جاری ہوں گے، اس سے انتفاع سود اور حرام ہے۔

جن بعض حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ سے اس صورت کے جواز، مفتی بہ ہونے اور معمول بہا فی بعض الدیار ہونے کو نقل کیا گیا ہے، دو وجہ سے صحیح نہیں:

اولاً: تو خود یہ فرما کر کہ:

''شاید یہ جواز کا قول اسی بنیاد پر ہے کہ یہ شرط متعارف ہوگئی ہے''

(غیر سودی بینکاری، ص:۲۴۴)

رد فرما دیا کہ اصل مسئلہ کے اعتبار سے یہ شرط و وعدہ مفسدِ عقد ہے، البتہ اگر ان شرائط ثلاثہ (یعنی مقتضائے عقد کے موافق ہو، ملائمِ عقد ہو، اس پر تعامل ہو) میں اس کو داخل کر دیا جائے جن کی وجہ سے عقد فاسد نہیں ہوتا تو پھر درست ہے.........لیکن اکثر حنفیہ کا اس صورت کو خالص رہن کہنا اور انتفاع کو صریح سود قرار دینا اور اس صورت کو حرام اور ربا کا حیلہ باطلہ فرمانا، تعامل اور تعارف کا انکار ہے۔

ثانیاً: جب فریقین اس بات پر متفق ہیں کہ اکثر حنفیہ اس صورت کو صریح سود فرماتے ہیں اور سود تعامل سے حلال نہیں ہوتا، جیسا کہ بحوالہ فتاوی محمودیہ لکھا ہے:

''ابتلاء عام حرام کو حلال کرنے میں مؤثر نہیں'' (غیر سودی بینکاری/۲۴۴)

تو اب اس کے خلاف بعض کی بات کو نقل کرنے کا کیا فائدہ؟

صورتِ ثانیہ اور ثالثہ یعنی عقد سے قبل شرط لگانے اور عقد کو غیر لازم سمجھنے کا حکم:

یہ حضرات فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصریحات اور اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے فتاوی کے پیش نظر صورتِ اولیٰ کی طرح ناجائز، مفسدِ عقد اور اس مبیع اور رہن سے انتفاع سود اور حرام ہے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه الله تعالیٰ: و قیل بیع یفید الانتفاع به و فی

اقالة شرح المجمع عن النهاية و عليه الفتوى، و قيل ان بلفظ البيع لم يكن رهنا ثم ان ذكرا الفسخ فيه او قبله أو زعماه غير لازم كان بيعا فاسدا و لو بعده على وجه الميعاد جاز و لزم الوفاء به. (رد المحتار ۷/ ۵۸۱،رشيديه)

﴿علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (بعض حضرات فرماتے ہیں کہ) بیع وفاء ایسی بیع ہے جس سے انتفاع حاصل کیا جاسکتا ہے......اور اسی پر فتوی ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر بیع وفاء لفظِ بیع کے ساتھ ہو تو رہن نہیں کہلایا جائے گا، پھر اگر دونوں عاقدین عقد بیع میں یا اس سے پہلے شرط ذکر کر دیں یا اس بیع کو لازم ہی نہ سمجھیں تو یہ بیع فاسد ہوگی، اور اگر عقد بیع کے بعد شرط فسخ بطور وعدہ کے ذکر کریں تو جائز اور پوری کرنا لازم ہوگا﴾

صورتِ رابعہ یعنی عقد کے بعد وفاء کی شرط لگانے کا حکم: یہ صورت بالاتفاق جائز ہے، اور اس صورت میں بعد العقد وعدے کا پورا کرنا دیانۃً واجب ہے۔ جیسا کہ فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصریحات اور اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے فتاوی سے واضح ہے۔

اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے فتاوی

(۱) حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بیع الوفاء کے ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

''وہ مکانات جو انجمن اسلامیہ کے کارکنان نے بیع بالخیار کے نام سے خرید کئے ہیں یہ بیع بالوفاء ہے اور اس میں فقہاء کا بہت اختلاف ہے۔ بعض رہن کہتے ہیں اور بعض بیع کہتے ہیں اور پھر یہ کہ بیع صحیح ہے یا بیع فاسد اوفق وانسب یہ ہے کہ یہ بیع ہے کیونکہ الفاظ بیع وشراء کے اس میں موجود ہیں پھر اگر بیع کے وقت اور بیع کے اندر شرط واپسی کی کی گئی تو بیع فاسد ہے کما ورد نھی عن بیع وشرط اور اگر بعد تمامی بیع وایجاب وقبول کو شرط واپسی کی کی گئی تو بیع صحیح ہے اور یہ شرط ایک وعدہ ہے جس کی وجہ سے بیع میں کچھ خرابی نہیں آتی ہے''

(عزیز الفتاوی ۶۰۵/ ۱، فصل فی البیع بالوفاء)

(۲) حضرت مفتی اعظم دیوبند وسہارنپور مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ بیع الوفاء سے متعلق فرماتے ہیں:

''اگر بیعنامہ میں یا مجلسِ عقد میں بطور شرط یا بطور وعدہ واپسی کا کوئی ذکر نہیں آیا، بلکہ جس طرح اور لوگ شب و روز بیع وشراء کرتے ہیں، اسی طرح زید و بکر نے بھی بیع وشراء کر لی پھر کسی دوسری مجلس میں دوسرے وقت زید نے بکر سے اس رعایت کی درخواست کر لی اور بکر نے اس کو منظور کرلیا تو شرعاً یہ بیع درست ہوگئی۔ اب زید کو قانوناً مطالبۂ واپسی کا کوئی حق باقی نہیں رہا وہ کسی طرح بکر کو واپسی پر مجبور نہیں کرسکتا، بکر کو اس جائداد میں مالکانہ تصرف کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے، اگر چاہے تو دوسرے شخص کو ہبہ یا بیع یا رہن سب کچھ کرسکتا ہے زید کو ان تصرفات سے روکنے کا حق حاصل نہیں۔

اور عرصہ معینہ فریقین میں اگر زید روپیہ ادا کردے تب بھی بکر کو اختیار ہے کہ وہ مناسب سمجھے اور اس کی مصالح کے خلاف نہ ہو اور بھی کوئی مانع نہ ہو تو واپس کردے اور اگر مصالح کے خلاف ہو اور نقصان ہوتا ہو تو اس کو واپسی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، بلکہ زید کا روپیہ لینے سے انکار کردے، غرض! قضاءً اس پر کوئی حق باقی نہیں رہا، البتہ دیانۃً اس وعدہ کا پورا کرنا بہتر ہے، تاہم اگر وعدہ کرتے وقت تو پورا کرنے کی نیت تھی لیکن بعد میں کسی مصلحت، ذاتی ضرورت یا احتمال نقصان کی بنا پر پورا نہیں کرتا تو شرعاً اس پر گناہ نہیں......(فتاوی محمودیہ ۲۵۵، ۱۶/۲۵۶)

(۳) اسی طرح دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''اگر یہ شرطیں ایجاب وقبول بیع سے پہلے کی گئی ہیں، یا بیع کے ساتھ کی گئی ہیں تو ان دونوں کا ایک حکم ہے۔ اگر بیع قطعی کی گئی اور پھر شرطیں لگادی گئیں تب بھی امام اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان شرطوں کا ایسا ہی حال ہے جیسا کہ نفسِ بیع میں لگا لینے سے ہوتا اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بیع ہوگئی اور اقرار نامہ علیحدہ

ہے اس کا پورا کرنا دیانۃً ضروری ہے اگر پورا نہیں کرے گا تو وعدہ خلاف کہلائے گا اس سے بیع پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ کے قول کو راجح بتایا ہے۔ (فتاوی محمودیہ ۱۶/۲۶۲)

تبصرہ: کتاب ''غیر سودی بینکاری'' کا فیصلہ مفتی اعظم سہارنپور و دیوبند حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی خلاف ہے، کیونکہ مفتی اعظم رحمہ اللہ تعالیٰ عقد سے قبل کو مفسد اور عقد کے بعد کو دیانۃً لازم فرماتے ہیں۔

(۴) ایسے ہی امداد المفتین میں ایک سوال کے جواب میں فرمایا گیا ہے:

''درمختار میں ہے: **و قيل بيع يفيد الانتفاع به و في اقالة شرح المجمع عن النهاية و عليه الفتوى، و قيل ان بلفظ البيع لم يكن رهنا ثم ان ذكرا الفسخ فيه او قبله أو زعماه غير لازم كان بيعا فاسدا و لو بعده على وجه الميعاد جاز و لزم الوفاء به الخ.** اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر شرط واپسی کی صلبِ عقد میں لگائی گئی جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے تو یہ بیع فاسد ہے جس کا فسخ کرنا متعاقدین پر واجب ہے البتہ اگر شرط واپسی صلبِ عقد میں نہ لگائی اور بعد عقد کے بطور وعدہ کے ذکر کی گئی تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی اور بعد ختم مدت کے واپس کرنا بیع کا اگر مشتری راضی ہو تو لازم ہوگا''۔ (امداد المفتین ۲/۶۹۶)

تنبیہ: عقد کے بعد کے وعدہ کو جائز فرمانا اور عقد سے پہلے وعدہ کے جواز کو ذکر نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کا حکم بھی صلبِ عقد میں وعدہ کرنے کی طرح ہے اس لئے عبارت بھی اسی کی موافق لائی گئی ہے۔

(۵) اسی طرح حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ بیع الوفاء سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

سوال: کوئی چیز کسی سے اس شرط پر خریدی کہ جب بائع رقم واپس دے گا تو یہ چیز اس کو واپس دے دی جائے گی، کیا یہ معاملہ جائز ہے؟

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر بیع کے اندر یا اس سے پہلے شرط لگائی گئی ہو یا جانبین اس عقد کو غیر لازم سمجھ رہے ہوں تو یہ بیع فاسد ہے اور اگر بیع کے بعد واپسی کا وعدہ کیا تو یہ بیع صحیح ہے اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے۔

قال فی العلائیة: و قیل بیع یفید الانتفاع به و فی اقالة شرح المجمع عن النهایة و علیه الفتوی، و قیل ان بلفظ البیع لم یکن رهنا ثم ان ذکرا الفسخ فیه او قبله أو زعماه غیر لازم کان بیعا فاسدا و لو بعده علی وجه المیعاد جاز و لزم الوفاء به . (ردالمحتار ۴/۲۷۴) واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(احسن الفتاوی ۶/۵۰۷)

دوسری صورت یعنی شرطِ وفاء قبل العقد کے جواز کے مستدلات کا تجزیہ:

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں مندرجہ بالا صریح عبارات فقہیہ اور اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کے فتاوی کے خلاف جواز کا قول لکھا گیا ہے اور اس پر بعض عباراتِ فقہیہ سے استدلال بھی کیا گیا ہے، ان عبارات سے استدلال کس حد تک درست ہے اور اس پر کیا کلام ہے؟ ملاحظہ ہو:

پہلی عبارت: فرماتے ہیں:

''لیکن اگر عقد بیع شرط سے خالی ہو، لیکن وفاء کی شرط عقد سے الگ ایک وعدے کے طور پر ذکر کی جائے تو اُسے درست قرار دیا جائے اور ایسی صورت میں وعدے کو بھی لازم قرار دیا جائے، جیسا کہ پیچھے وعدے کی بحث میں گزر چکا ہے، اور اس کے بارے میں محیط میں فرمایا گیا ہے:

و بعض مشایخ سمر قند قالوا: اذا لم یکن الوفاء مشروطا فی البیع یجعل هذا بیعا صحیحا فی حق المشتری حتی یحل له الانتفاع بالمشتری کما یحل الانتفاع بسائر أملاکه و یجعل رهنا فی حق البائع حتی لا یتمکن المشتری من بیعه و اذا مات لا یورث عنه و اذا جاء البائع بالمال یؤمر المشتری بأخذ المال و رد المبیع علیه و یجوز أن یکون للعقد الواحد حکمان و قد مر نظیر هذا فی السلم و انما فعلنا هکذا لحاجة الناس بعضهم الی أموال البعض مع صیانتهم عن الوقوع فی الربا .

(المحیط البرهانی، کتاب البیوع، الفصل ۲۵، ج ۱۰، ص ۳۶۹، ط ادارة القرآن، / غیر سودی بینکاری ص ۲۴۴)

تبصرہ: اس عبارت میں قبل العقد شرطِ وفاء کا صراحۃً ذکر نہیں، لہٰذا اس کو دوسری صریح عبارات کے مطابق بعد العقد پر محمول کیا جائے گا۔

دوسری عبارت: فتاوی قاضی خان میں ہے:

و اختلفوا فی البیع الذی یسمیه الناس بیع الوفاء أو بیع الجائز، قال أکثر المشایخ منهم السید الامام أبو شجاع و قاضی الامام أبو الحسن علی السغدی: حکمه حکم الرهن ...... و الصحیح أن العقد الذی جری بینهما ان کان بلفظ البیع لا یکون رهنا. ثم ینظر ان ذکرا شرط الفسخ فی البیع فسدالبیع، وان لم یذکرا ذلک فی البیع وتلفظا بلفظة البیع بشرط الوفاء، أوتلفظا بالبیع الجائز، وعندهما هذا البیع عبارة عن عقد غیر لازم فکذلک. وان ذکر البیع من غیر شرط ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة جاز البیع، ویلزمه الوفاء بالوعد، لأن المواعدة قد تکون لازمة، فتجعل لازمة لحاجة الناس''.(الفتاوی الخانیة علی هامش

الهندية ج ۲ ص ۱۶۴ ، ۱۶۵،/ غیر سودی بینکاری ص ۲۴۵)

﴿یہ بیع جس کولوگ بیع وفاء یا بیع جائز کہتے ہیں اس کے حکم میں علماء کا اختلاف ہے، اکثر مشایخ جن میں سے امام ابوشجاع اور قاضی ابوالحسن علی سغدی رحمہما اللہ تعالیٰ بھی ہیں فرماتے ہیں: کہ یہ رہن کے حکم میں ہے...... صحیح بات یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عقد اگر لفظِ بیع سے ہوا ہے تو عقد رہن نہیں ہوگا بلکہ دیکھا جائے گا کہ اگر انہوں نے شرط فسخ کو صلبِ عقد یعنی عقدِ بیع کے درمیان میں ذکر کیا ہے تو یہ بیع فاسد ہے، اور اگر عقدِ بیع کے درمیان میں شرط ذکر نہیں کی، اور ''بیع بشرط الوفاء'' یا ''بیع جائز'' کے الفاظ سے بیع کا معاملہ کیا، مگر دونوں فریق اس بیع کو ''عقد غیر لازم'' سمجھتے ہیں، تو بھی حکم یہی ہے کہ یہ بیع فاسد ہے۔ اور اگر عقدِ بیع بغیر کسی شرط کے کرلیا پھر بعد میں شرطِ فسخ کو بطور وعدہ کے ذکر کرلیا تو یہ بیع جائز ہے اور وعدے کو پورا کرنا لازم ہے، اس لئے کہ آپس میں وعدہ کرنا کبھی کبھی لازم بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس کو پورا کرنا لوگوں کی ضرورت وحاجت کی بناء پر لازم کیا گیا ہے﴾

تبصرہ: اس عبارت میں ''**ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع الخ**''، یعنی ''پھر بعد میں شرطِ فسخ کو بطور وعدہ کے ذکر کرلیا تو یہ بیع جائز ہے'' واضح دلیل ہے کہ بعد العقد وعدہ اور شرط کا بیان ہے نہ کہ قبل العقد۔

تیسری عبارت: جامع الفصولین میں ہے :

''**شرطا شرطا فاسدا قبل العقد، ثم عقدا لم يبطل العقد، ويبطل لو تقارنا.**'' (فنقز)

بعض مشايخ زماننا قالوا : الشرط لو لم يكن فى العقد جعلنا بيعاً صحيحاً فى حق المشترى حتى ينتفع بالمبيع كسائر أملاكه، وجعلناه رهناً فى حق البائع حتى لم يجز بيع المبيع، ويجبر المشترى على قبول

الثمن وردّ المبيع على بائعه، لأن هذا البيع مركب منهما كهبة بشرط عوض وهبة في المرض، وكثير من الاحكام يكون له حكمان وانما جعلناه كذلك لحاجة الناس اليه حذراً عن الربى خصوصاً في ديارنا فانهم ببلخ اعتادوا في هذا الباب الدين و الاجارة الطويلة و لم يمكنهم في الكرم، و الاجارة في الكرم لا تصح لما عرف، و ببخارى اعتادوا الاجارة الطويلة، و لم يمكنهم ذلك الا بعد شراء الأشجار، و هذا الشراء عقد وفاء فاضطرّوا الى ما قلنا،و ما ضاق على الناس اتسع حكمه‘‘.

پھر بعض فقہاء کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے اس بات کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ وفاء کا وعدہ چاہے بیع سے پہلے ہو یا بیع کے بعد ہوا سے صلبِ عقد میں شرط لگانا نہیں سمجھا جائے گا، اوراسکی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوگی، چنانچہ جامع الفصولین میں ہی فرمایا گیا ہے کہ:

’’ولو تواضعا قبل البيع ثم تبايعا بلا ذكر شرط جاز البيع عند ح رحمه الله الا اذا تصادقا أنهما تبايعا على ذلك المواضعة، وكذا لو تواضعا الوفاء قبل البيع ثم عقدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز، ولا عبرة للمواضعة السابقة.‘‘(جامع الفصولين ،الفصل ۱۸ فى بيع الوفاء ج ۱ ص ۲۳۷ اسلامی كتب خانه بنورى ٹاؤن ،/ غير سودى بينكارى ص ۲۴۵،۲۴۶)

تبصرہ: اس پوری عبارت کا حاصل دو باتیں ہیں۔

(۱) وفاء کی شرط عقد سے پہلے لگائی گئی اور پھر عقد میں لفظاً اس شرط کا ذکر نہیں کیا البتہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ شرطِ وفاء کی بنیاد پر یہ بیع ہوئی ہے......تو یہ عقد جائز نہیں ......دیکھیے ’’ولو تواضعا قبل البيع ثم تبايعا بلا ذكر شرط جاز البيع عند ح

رحمہ اللہ الا اذا تصادقا أنھما تبایعا علی ذلک المواضعۃ
"(ترجمہ: اگر عاقدین بیع سے قبل آپس میں اتفاق کرلیں پھر شرط کے ذکر کے بغیر بیع وشراء کرلیں تو بیع جائز ہے سوائے اس صورت کے کہ جب وہ دونوں اس بات پر اتفاق کرلیں کہ انہوں نے بیع اُسی سابقہ شرط کی بنیاد پر ہی کی ہے) اس بات پر صراحۃً دال ہے۔

(۲) وفاء کی شرط عقد سے پہلے تھی لیکن عقد کے وقت نہ لفظاً اس کا ذکر ہے اور نہ ہی معنیً وحکماً کہ اس شرط کی بنیاد پر عقد ہوا ہو، تو یہ عقد جائز تو ہے لیکن شرطِ وفاء کا کوئی اعتبار نہیں یعنی مبیع کو واپس کرنا اس شرط کی بناء پر اس پر لازم نہیں۔

دیکھیے "**وکذا لو تواضعا الوفاء قبل البیع ثم عقدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز، ولا عبرۃ للمواضعۃ السابقۃ** "(ترجمہ: اسی طرح اگر وہ دونوں وفاء کی شرط پر عقد سے پہلے اتفاق کرلیں تو عقد جائز ہے، اور اُس سابقہ اتفاق کا کوئی اعتبار نہیں) کی عبارت اس کی واضح دلیل ہے۔

جامع الفصولین کی عبارت کی بنیاد پر یہ لکھنا:

> "پھر بعض فقہاء کرام (رحمہم اللہ تعالیٰ) نے اس بات کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ وفاء کا وعدہ چاہے بیع سے پہلے ہو یا بیع کے بعد ہوا سے صلبِ عقد میں شرط لگانا نہیں سمجھا جائے گا، اور اسکی وجہ سے بیع فاسد نہیں ہوگی" (غیر سودی بینکاری ۲۴۶)

کسی طرح بھی ان کے مدعی کے مطابق نہیں، کیونکہ "تصادقا" کی صورت میں فساد کی تصریح اور "عدمِ تصادق" کی صورت میں شرط کا غیر معتبر ہونا دونوں "کتاب" کے مدعا کے خلاف ہیں، کیونکہ مدعا دو چیزیں ہیں (۱) صحتِ عقد اور (۲) اعتبارِ شرط، جبکہ جامع الفصولین کی عبارت میں جہاں صحتِ عقد ہے، وہاں شرط معتبر نہیں، اور جہاں شرط معتبر ہے، وہاں عقد صحیح نہیں۔

چوتھی عبارت: لکھا ہے:

''اور جامع الفصولین میں اس مسئلہ کو صرف بیع بالوفاء کے معاملے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے ایک عام حکم کے طور پر اس طرح ذکر فرمایا ہے۔

''**شرطا شرطا فاسدا قبل العقد، ثم عقدا لم يبطل العقد، ويبطل لو تقارنا**''۔ (ایضاص ۲۳۷، غیر سودی بینکاری ۲۴۶)

تبصرہ: یہ عبارت بھی اصل مدعا کے خلاف ہے کیونکہ اس عبارت میں عدمِ بطلانِ عقد کا بیان تو ہے بشرطِ عدمِ تقارن، لیکن اس شرط کو لازم قرار دینے کا حکم تو نہیں بلکہ جامع الفصولین کی سابقہ عبارت میں شرط کے غیر معتبر ہونے کی صراحت ہے، جبکہ کتاب میں اس شرط کو صرف لازم ہی نہیں بلکہ قضاءً لازم اور خلاف کی صورت میں بعض نقصانات کے ضمان کا سبب بھی بنایا ہے:

پانچویں عبارت: صفحہ ۲۴۷ پر علامہ خالد اتاسی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارت نقل فرمائی ہے کہ انہوں نے علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اعتراض کا جواب دیا ہے۔

تبصرہ: صفحہ نمبر ۲۴۸ پر الحمدللہ تعالیٰ کتاب میں علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کے اعتراض کو صحیح قرار دیا ہے اور علامہ اتاسی رحمہ اللہ تعالیٰ کے جواب کو مخدوش لکھا ہے، چنانچہ لکھا ہے:

''اور حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جامع الفصولین میں بھی پہلے وعدے کو غیر مفسد اس صورت میں فرمایا ہے جب وہ بیع کرتے وقت یہ تصادق نہ کریں کہ بیع اس سابقہ وعدہ کی بنیاد پر ہو رہی ہے لیکن اگر بیع کے عقد کے وقت انہوں نے اس قسم کی کوئی بات کہہ دی کہ اس بیع کو اُس سابق وعدے پر مبنی کیا جارہا ہے تو اس صورت میں صاحبِ جامع الفصولین نے بھی بیع کو جائز نہیں کہا جیسا کہ اوپر کی عبارت میں ان الفاظ: ''**ولو تواضعا قبل البيع ثم تبايعا بلا ذكر شرط جاز البيع عند ح رحمه الله الا اذا تصادقا أنهما تبايعا على ذلك المواضعة**'' سے ظاہر ہے۔ علامہ ابن عابدین (رحمہ اللہ

تعالیٰ) کو اعتراض اس صورت پر تھا جب وہ بیع کی بنا اس وعدے پر کریں اس صورت میں وہ اسے فاسد قرار دینا راجح سمجھتے تھے اور اس صورت کو جامع الفصولین میں بھی جواز سے مستثنیٰ کر کے فاسد کہا ہے لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض معلوم نہیں ہوتا **لیکن یہ اسی وقت ہے جب بیع کے وقت وہ اس بات کا ذکر کریں کہ یہ بیع اس وعدے پر مبنی ہے کیونکہ اس صورت میں وہ بیع بالشرط بن گئی ہے جو ناجائز ہے۔**'' (غیر سودی بینکاری ۲۴۸)

تنبیہ: جلی الفاظ میں ایک نیا دعویٰ کیا گیا ہے اور اس کو عبارتِ جامع الفصولین سے مستنبط قرار دیا ہے، چونکہ دعویٰ کا حق ہر ایک کو ہے اس لئے اس سلسلہ میں ہم کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتے اور ہماری حیثیت ہی کیا ہے کہ ہم شکایت کریں، البتہ ''چھوٹا منہ بڑی بات'' یہ استنباط درست معلوم نہیں ہوتا......اب دعویٰ اور استنباط سمجھئے۔

دعویٰ: یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ عقد کے وقت جب تک زبان سے یہ بات صراحۃً نہ کہے کہ یہ عقد پہلی شرط کی بنیاد پر ہو رہا ہے تو یہ بیع صحیح ہے اور اس کو بیع بالشرط نہیں کہا جائے گا اگرچہ دل اور قرائن سے دونوں کسی شرط کی بنیاد پر ہی عقد کر رہے ہوں، اور عقد مکمل ہونے کے بعد دونوں اس بات پر متفق ہوں کہ ہم نے جو بلا ذکرِ شرط عقد کیا ہے یہ حقیقت میں بلا شرط نہیں بلکہ بالشرط ہے۔

استنباط: معلوم ہوتا ہے کہ جامع الفصولین کی عبارت ''**ولو تواضعا الخ**'' سے استنباط فرمایا گیا ہے اور ''**الا اذا تصادقا الخ**'' کو وقتِ عقد پر محمول کیا ہے۔ جبکہ اس سے پہلے ''**ثم تبایعا بلا ذکر شرط**'' کی صراحت اس حمل اور استنباط کو رد کر رہی ہے۔

دیکھیے! یہاں دو صورتوں کا بیان ہے:

(۱) بیع بھی بدون ذکرِ شرط ہے اور بعد عقدِ بیع تصادق بھی نہیں۔

(۲) بیع بدون ذکر شرط ہے البتہ بعد عقدِ بیع تصادق ہے۔

دونوں صورتوں میں عقد کے وقت شرطِ سابق کا کسی طرح بھی زبان سے ذکر نہیں البتہ ایک صورت میں جانبین دل سے سمجھتے ہیں کہ شرطِ سابق کی بنیاد ہی پر یہ سب کچھ ہورہا ہے، اسی لئے تو فرمایا: **الا اذا تصادقا انهما تبايعا على ذلك المواضعة**، اس عبارت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ عقد کے بعد دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انہوں نے اس سے پہلے جو بیع کی ہے وہ اسی شرط کی بنیاد پر ہے، اور دوسری صورت میں دونوں سمجھتے ہیں کہ شرطِ سابق سے صرفِ نظر کرکے یہ عقد ہورہا ہے، اسی لئے تو فرمایا ''**ولا عبرة للمواضعة**''۔

الحاصل : اس عبارت سے جو بات مستنبط ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سابق شرط کو معتبر سمجھتے ہوئے جو عقد ہوگا اگر عقد کے وقت اس کا تلفظ نہ بھی ہو وہ عقد بالشرط ہوگا، اور اسکے تمام احکام اس پر جاری ہونگے۔ جیسا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا:

> ''الجواب: اس میں دو مقام قابل جواب ہیں ایک یہ کہ زید وعمرو میں جو گفتگو ہوئی یہ وعدۂ محضہ ہے کسی کے ذمہ بحکم عقد لازم نہیں اگر زید کے منگانے کے بعد بھی عمرو انکار کردے تو زید کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں پس اگر عرف وعادت میں عمرو مجبور سمجھا جاتا ہو تو یہ معاملہ حرام ہے ورنہ حلال'' الخ۔ (امداد الفتاوی ۳/۴۰)

تصادق کو وقتِ عقد کے ساتھ مختص کرکے اس کو بیع بالشرط سے خارج کرنا کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا جب یہ استنباط ہی درست نہیں، تو اس پر آگے جتنی تعمیر کی گئی ہے (مرابحۂ مؤجلہ بنوکیہ اور اجارۂ بنوکیہ میں قبل العقد وعدۂ بیع واجارہ معتبر ہونا) وہ بھی درست نہ ہوگی۔

عقد سے قبل وعدۂ بیع اور حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کا رد اور فتاویٰ:

(۱) حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ ایک سوال کا جواب

دیتے ہوئے وعدہ قبل العقد کو ناجائز فرماتے ہیں، سوال و جواب دونوں ملاحظہ فرمائیں:

''سوال (۳۵): عمرو نے زید کو مبلغ سو روپے واسطے خرید نے جفت پاپوش کے دیئے اور کوئی اجرت بطور معاوضہ خریداری کے قرار نہیں پائی متعاقدین میں اجرت کی نسبت ذکر بھی نہیں آیا اور قبل خریداری مال اور دینے زر کی قیمت کے باہمی یہ امر طے ہو چکا تھا کہ یہ مال سوا چھ روپے سیکڑہ کے منافع سے بمیعاد ایک مہینے کے تم کو دے دیں گے مال دساور سے خرید کر زید اپنے گھر لے آیا اور عمرو کو بلا کر مال دکھلا کر جوڑ دیا یعنی شمار کرا دیا اور دونوں نے سمجھ لیا کہ یہ مال مبلغ سو روپے کا ہے اس کے بعد عمرو نے زید سے دریافت کیا کہ تم یہ مال ہم سے کس قدر مدت کے واسطے بشرح منافع مذکورہ بالا لیتے ہو زید نے کہا کہ ایک ماہ کے واسطے لیتا ہوں عمرو نے اس کو قبول کیا، بعد ختم ہونے مدت ایک ماہ کے عمرو نے زید سے اصل روپیہ مع منافع طلب کیا زید نے صرف منافع مبلغ سوا چھ روپے عمرو کو دے کر اصل روپیہ کی نسبت عذر کیا کہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں ہے، بلکہ کچھ مال موجود ہے، کچھ نقد ہے اور کچھ ادھار میں ہے، عمرو نے کہا کہ اگر تمہارے پاس زر اصل موجود نہیں ہے تو تم اس کے عوض میں اس قدر کا مال آئندہ کے لئے مجھ کو دے کر اور جوڑوا کر پھر ہم سے اس کو خرید لو، زید نے مبلغ سو روپے کا مال اپنے پاس دکھلایا اور عمرو کو دے کر جوڑوا دیا اور پھر بشرح منافع بالا عمرو سے خرید لیا اور مدت کبھی ایک ماہ تراضیٔ طرفین سے قرار پاتی ہے اور کبھی زائد۔

الجواب: یہاں دو بیعیں علی سبیل التعاقب ہیں ایک وہ کہ زید نے عمرو سے مال خریدا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر زید عمرو کو اور عمرو زید کو بیع وشراء پر بنا بر وعدہ سابقہ مجبور نہ کرے تو جائز ہے اور اگر مجبور کرے، ناجائز ہے۔ دوسرے بیع وہ جو سو روپیہ بقیہ زرِ ثمن کے عوض میں زید نے عمرو کو دیا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں یہ شرط ٹھہری کہ پھر عمرو سے زید اس کو خریدے گا تو حرام ہے اور اگر یہ شرط نہ ٹھہری پھر اگر آزادی سے جدید رائے سے خریدے

تو جائز ہے۔‘‘ (امداد الفتاوی ۳/۴۰)

(۳) وعدۂ بیع کی صورت میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ تو مشتری کے حق کو تحفظ فراہم کرتے ہیں نہ کہ بائع کے حق کو کما یصنع فی البنوک۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

’’سوال (۳۶): زید نے عمرو سے کہا میں تم کو روپیہ دیتا ہوں اور تمہارے لانے کی اور بار برداری کی اجرت اور کرایہ دیتا ہوں تم میرے اجیر بن کر مال لا دو تا کہ پھر تم اس مال میں نقص نہ بتاؤ۔

الجواب: اس کہنے سے عمرو کا حق مال کو ناقص بتلانے کا وقت بیع مرابحہ فیما بینہما زائل نہیں ہوا عمرو کو مثل مشتری اجنبی کے تمام حقوق حاصل ہیں البتہ زید کو یہ اختیار ہے کہ جس وقت عمرو اجیر وکیل ہونے کی حیثیت سے مال لایا ہے اگر ناقص مال لانے سے منع کر دیا تھا تو ناقص ہونے کی صورت میں عمرو سے بوجہ مخالفت کرنے کے روپیہ لے لے مگر جب مال کو قبول کر لیا تو زید کو تو کوئی حق نہیں رہا مگر عمرو کو یہی حق حاصل ہے۔‘‘

(امداد الفتاوی ۳/۴۱)

(۴) ’’وکیل بالشراء نے اپنے موکل سے مال خریدا اور ثمن قسط وار دینے کا وعدہ پورا نہ کیا‘‘ کے عنوان کے تحت سوال کے جواب میں حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ نے مشتری کو وعدہ خلافی کی وجہ سے گناہگار تو فرمایا ہے لیکن التزام کا حیلہ اختیار کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔

لکھتے ہیں:

’’سوال (۳۸): عمرو اپنے عہد کے موافق ایک ماہ کے بعد زید کو روپیہ نہیں دیتا اور روپیہ جمع کر رکھا ہے اور اس روپیہ سے خود مال لاتا ہے اور فروخت کرتا رہتا ہے منافع اٹھاتا ہے کبھی ڈیڑھ ماہ میں کبھی دو ماہ میں۔ غرض خلاف عہد زیادہ مدت میں روپیہ اصل مع منافع کے دیتا ہے مگر جس قدر مدت عہد سے زیادہ ہوتی ہے نہ اس کا منافع طلب ہوتا

ہے نہ دیا لیا جاتا ہے۔

الجواب: جب زیادہ نہیں لیا جاتا زید پر کوئی گناہ نہیں، عمرو پر وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا‘‘

(امداد الفتاوی ۳/۴۲،۴۱)

تبصرہ: دیکھیے حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے کس شدت کے ساتھ مجوزین حضرات کے استدلال کو رد فرمایا ہے، اور مرابحہ، اجارہ بنوکیہ کے وعدوں اور شرطوں کو کس شدت سے رد فرما کر اس معاملہ کو حرام فرمایا ہے............ نیز حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے آگے سوال نمبر ۳۵ کے جواب میں فرمایا ہے:

’’اگر زید عمرو کو اور عمرو زید کو بیع و شراء پر بنا بر وعدہ سابقہ مجبور نہ کرے تو جائز ہے اور اگر مجبور کرے، ناجائز ہے۔ دوسرے بیع وہ جو سو روپیہ بقیہ زرِ ثمن کے عوض میں زید نے عمرو کو دیا اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس میں یہ شرط ٹھہری کہ پھر عمرو سے زید اس کو خریدے گا تو حرام ہے اور اگر یہ شرط نہ ٹھہری پھر اگر خریدے آزادی سے جدید رائے سے خریدے تو جائز ہے‘‘۔ (امداد الفتاویٰ ۳/۴۰)

تبصرہ: تمام مرابحاتِ بنوکیہ اور اجاراتِ بنوکیہ میں ان شروط کی پابندی لازم ہے اور ان کے خلاف پر جرمانے ہیں، جب کہ حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پابندی اور شرط کو ناجائز اور حرام فرمایا ہے۔

الحاصل! حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے مندرجہ بالا فتاویٰ سے بھی ثابت ہوا کہ اجارہ بنوکیہ میں صلبِ عقد سے پہلے جو شرائط لگائی جاتی ہیں وہ ناجائز اور مفسدِ عقد ہیں۔

کیا شرطِ وفاء قبل العقد میں دو قول ہیں؟

کتاب ’’غیر سودی بینکاری‘‘ میں لکھا ہے :

’’واقعہ یہ ہے کہ فتاویٰ خیریہ کی عبارت اگرچہ صریح نہیں اور اس میں یہ احتمال بھی

موجود ہے کہ ''علی ما تواضعا'' کا مطلب یہ لیا جائے کہ ان کی سابقہ مفاہمت عقد کو فاسد نہیں کرے گی لیکن عقد سے خارج ایک وعدے کی حیثیت میں معتبر ہوگی، لیکن اس کتاب کی عبارتوں کو سیاق وسباق کے ساتھ دیکھنے سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ''علی ما تواضعا'' کا مطلب یہ ہے کہ وعدہ سابقہ کو مشروط فی البیع سمجھا جائے گا اور بیع فاسد ہوگی لیکن جامع الفصولین کی عبارت اس پر صریح ہے کہ عقد صحیح ہوگا اور اسے اس وقت تک مشروط نہیں سمجھا جائے گا جب تک عقد کرتے وقت وہ صراحت نہ کرے کہ یہ عقد وعدۂ سابقہ پر مبنی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس معاملہ میں دونوں قول موجود ہیں اور حضرت حکیم الامتؒ نے جواز کے قول کو بر بنائے حاجت ترجیح دی ہے''۔

(غیر سودی بینکاری ۲۵۱،۲۵۲)

تبصرہ: ٹھیک ہے! جامع الفصولین کی عبارت صحتِ عقد میں تو صریح ہے، لیکن شرط کے معتبر ہونے میں تو صریح نہیں، بلکہ صراحۃً اس میں شرط کے غیر معتبر ہونے کا ذکر ہے (**ولا عبرۃ للمواضعۃ السابقۃ**) تو اس جواز کے قول سے بھی ان حضرات کا مقصد حاصل نہ ہوا، کیونکہ مقصد عقد کو صحیح قرار دینے کے ساتھ ساتھ شرط کو لازم کرنا بھی ہے اور اس میں لزومِ شرط کی بات نہیں، نیز اس مطلب پر حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتویٰ کو محمول کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

ایک سوال اور اس کا جواب، پھر دونوں پر تبصرہ:

لکھا ہے :

''یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وعدۂ سابقہ کے باوجود بیع من غیر تلفظ الشرط کو جائز کہا جائے، جیسا کہ جامع الفصولین میں مذکور ہے اور جیسا کہ امداد الفتاویٰ میں اس پر فتویٰ دیا گیا ہے، تو یہ محض ایک لفظی فرق رہ گیا جب کہ فریقین جانتے ہیں کہ بیع اسی

وعدے کی بنیاد پر ہو رہی ہے، لہٰذا اس میں اور تلفظ بالشرط میں کوئی جوہری فرق نہ رہا اس سوال کا جواب بندے نے ''بحوث فی قضایا فقهية معاصرة'' میں اس طرح دیا ہے۔

''و الجواب عن هذا الا شكال على ما ظهر لى و الله سبحانه اعلم. أن الفرق بين المسالتين ليس فى الصورة فحسب. بل هناک فرق دقيق فى الحقيقة أيضاً.

وذلک أن العقد الواحد ان كان مشروطاً بالعقد الآخر، والذى يعبر عنه بالصفقة فى الصفقة، لا يكون عقداً باتّاً، وانما يتوقف على عقد آخر بحيث لا يتمّ العقد الأول الا به ،فكان فى معنى العقد المعلق أو العقد المضاف الى زمن مستقبل.فاذا قال البائع للمشترى : بعتک هذه الدار على أن تؤجر الدار الفلا نية لى بأجرة كذا، فمعناه : أن البيع موقوف على الاجارة اللاحقة ومتىٰ توقف العقد على واقع لاحق ،خرج من حيّز كونه باتّاً ،وصار عقداً معلقاً، والتعليق فى عقد المعاوضة لا يجوز، ولو حكمنا بمقتضى هذا العقد، وامتنع المشترى من الاجارة، فان ذلک يستلزم أن يرتفع البيع تلقائياً، لأنه كان مشروطاً بالاجارة ،وعند فوات الشرط يفوت المشروط.

فالعقد اذا شرط معه عقد آخر، وكان ذلک فى معنى تعليق العقد الأول على العقد الثانى ،صار كأنه قال : ان آجرتنى الدار الفلانية بكذا، فدارى بيع عليک بكذا ،وهذا مما لا يجيزه أحد، لأن البيع لا يقبل التعليق.

وهذا بخلاف مالو ذكرا ذلک على سبيل المواعدة فى أول الأمر، ثم عقدا البيع مطلقاً عن شرط. فان البيع ينعقد من غير تعليق بيعاً باتاً،

ولا يتوقف تمامه على عقد الاجارة. فلو امتنع المشترى من الايجار بعد ذلك، فانه لا يؤثر على هذا البيع البات شيئاً، فيبقى البيع تاماً على حاله. وغاية الأمر أن يُجبر المشترى على الوفاء بوعده على القول بلزوم الوعد، لأنه أدخل البائع فى البيع بوعده، فلزم عليه أن يفى بذلك الوعد قضاءً عند من يقول بذلك .وهذا شئ لاأثر له على البيع الباتّ الذى حصل بدون أى شرط، فانه يبقى تاماً، ولو لم يف المشترى بوعده.

وبهذا تبين أن البيع اذا اشترط فيه العقد الآخر يبقى متردداً بين التمام والفسخ، وان هذا التردد يورث فيه الفساد، بخلاف البيع المطلق الذى سببه الوعد بالشئ، فانه لا تردّد فى تمام البيع، فانه يتم فى كل حال، وغاية الأمر ،أن يكون الوعد السابق لازماً على المشترى على قول من يقول بلزوم الوعد.'' (بحوث فى قضايا فقهية معاصرة ج ١/ ٢٥٥،٢٥٦)(غير سودى بينكارى ص ٢٥٢ تا ٢٥٤)

میرے علم کی حد تک اس اشکال کا جواب یہ ہے ۔ واللہ اعلم ۔ کہ ان دونوں مسئلوں میں صرف ظاہری اور لفظی فرق نہیں ہے بلکہ حقیقی طور پر ان دونوں میں باریک فرق ہے وہ یہ کہ اگر ایک عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط ہو جس کو اصطلاح میں ''صفقہ فی صفقہ'' کہتے ہیں اس میں پہلا عقد مستقل اور قطعی نہیں ہوتا بلکہ یہ پہلا عقد دوسرے عقد پر اس طرح موقوف ہوتا ہے کہ یہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوسکتا جس طرح ایک معلق عقد ہوتا ہے۔

لہٰذا جب بائع نے مشتری سے کہا کہ میں یہ مکان تمھیں اس شرط پر بیچتا ہوں کہ تم اپنا فلاں مکان مجھے اتنے کرائے پر دو گے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیع آئندہ ہونے والی

اجارہ پر موقوف رہے گی اور جب عقد کسی آئندہ کے معاملے پر موقوف ہوتو اس صورت میں اس عقد کو مستقل عقد نہیں کہا جائے گا بلکہ عقد معلق کہا جائے گا اور عقودِ معاوضہ میں تعلیق جائز نہیں۔

اور اگر اس بیع کو نافذ کردیں اس کے بعد مشتری عقد اجارہ کرنے سے انکار کردے تو اس صورت میں عقدِ بیع خود بخود کالعدم ہو جائے گا اس لئے کہ عقدِ بیع تو عقدِ اجارہ کے ساتھ مشروط تھا اور قاعدہ یہ ہے کہ جب شرط فوت ہو جائے تو مشروط خود بخود فوت ہو جائے گا۔

لہٰذا جب ایک عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط ہوتو اس کا مطلب یہ ہے کہ عقدِ اول عقدِ ثانی کے ساتھ معلق ہو جائے گا، گویا بائع نے مشتری سے یہ کہا کہ اگر تم اپنا فلاں مکان اتنے کرائے پر دو گے تو میں اپنا یہ مکان تمھیں اتنے پر فروخت کردوں گا، ظاہر یہ ہے کہ یہ عقد کسی امام کے نزدیک جائز نہیں اس لئے کہ بیع تعلیق کو قبول نہیں کرتی ہے۔

برخلاف اس کے کہ بائع اور مشتری ابتداءً ہی عقدِ اجارہ کو بطورِ ایک وعدہ کے طے کر لیں پھر مطلق غیر مشروط طور پر عقدِ بیع کریں تو اس صورت میں یہ عقدِ بیع مستقل اور غیر مشروط ہوگی اور عقدِ اجارہ پر موقوف نہیں ہوگی لہٰذا اگر عقدِ بیع مکمل ہو جانے کے بعد مشتری عقدِ اجارہ کرنے سے انکار کردے تو اس صورت میں عقدِ بیع پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، عقدِ بیع اپنی جگہ پر مکمل اور درست ہو جائے گی۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ چونکہ وعدہ پورا کرنا بھی لازم ہوتا ہے اس لئے مشتری کو اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے وعدے کو پورا کرے اس لئے کہ اس نے اس وعدہ کے ذریعے بائع کو اس بیع پر آمادہ کیا ہے چنانچہ مالکیہ کے نزدیک قضاءً بھی اس وعدے کو پورا کرنا مشتری کے ذمہ ضروری ہے، البتہ اس وعدے کا اس بیع پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جو بیع غیر مشروط طور پر ہوئی ہے لہٰذا اگر مشتری اپنا وعدہ پورا نہ بھی کرے تب

بھی بیع اپنی جگہ پر تام سمجھی جائیگی۔(فقہی مقالات ۲/۲۴۴،۲۴۵)

تبصرہ: **اولاً:** تو جو سوال قائم کیا گیا ہے درست نہیں کیونکہ جامع الفصولین میں یہ کہیں بھی لکھا ہوا نہیں کہ شرطِ سابق کی بنیاد پر جو بیع ہو جائے اور تلفظاً شرط کا ذکر نہ ہو تو وہ جائز ہے...... بلکہ اس کے خلاف لکھا ہے، دیکھیے **''ثم تبایعا بلا ذکر شرط جاز البیع عندح رحمہ اللہ تعالیٰ الا اذا تصادقا انھما تبایعا علی ذلک المواضعۃ''** کی عبارت میں **''بلا ذکر شرط''** کی دوصورتوں کا بیان ہے ایک یہ کہ شرط کا ذکر اور تلفظ بھی نہ ہو اور تصادق بھی نہ ہو یعنی اس کی بنیاد پر عقد بھی نہ ہو یہ جائز ہے۔ دوسری یہ کہ شرط کا ذکر اور تلفظ تو نہ ہو البتہ تصادق ہو یعنی جانبین اس بات پر متفق ہوں کہ یہ عقد سابق شرط کی بنیاد پر ہو رہا ہے، یہ ناجائز ہے۔

یہ سوال ہی غلط ہے اور جب سوال غلط، تو جواب پر تبصرے کی ضرورت نہیں لیکن چونکہ جواب میں چند دعوے کیے گئے ہیں اس لئے اس پر بھی مختصر تبصرہ ضروری ہے۔

(۱) صفقہ فی صفقہ کی ایک صورت کو تسلیم کرتے ہوئے فرمایا ہے **''وھذا مما لایجیزہ احد لان البیع لا یقبل التعلیق''**۔

تبصرہ: **اولاً:** جو عقد سابق شرط کی بنیاد پر ہو رہا ہے وہ مشروط اور معلق ہی ہے اس وجہ سے جامع الفصولین وغیرہ میں اس عقد کو فاسد کہا گیا ہے۔

ثانیاً: **''المعروف کالمشروط''** کے قاعدہ کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ان تمام شرطوں سے عقد مشروط اور معلق ہے۔(اگر یہ شرطیں ہیں تو عقد ہے ورنہ نہیں)

ثالثاً: حضرت حکیم الامت قدس سرہ بھی اس کو معنی وحکماً فرما رہے ہیں، نہ کہ تلفظاً اور حکم مثل تلفظ کے دے رہے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''مواضعت پیشین غیر معتبر نہیں ہوئی کما زعمہ البعض، بلکہ معتبر ہوگی اور عقد صورۃً

مطلق عن الشرط ہوگا ومعنی مقید بہ الخ‘‘۔(غیر سودی بینکاری ۲۵۱)

لہٰذا یہ بھی ’’صفقۃ فی صفقۃ‘‘ میں داخل اور ناجائز ہے اور یہ کہا جائے گا کہ یہ اجارہ، بیع اور ہبہ کی شرط کے ساتھ مشروط اور اس پر معلق ہے اگر بینک کہے کہ آخر میں ہم گاڑی تم سے واپس لے لیں گے، نہ تو کم قیمت پر بیع کریں گے اور نہ ہی ہدیہ و ہبہ دیں گے، تو کوئی بھی بینک سے گاڑی لینے کے لئے تیار نہ ہوگا۔

(۲) لکھا ہے :

’’عقد اگرچہ شرطِ سابق کی بنیاد پر ہو لیکن جب بوقتِ عقد تلفظ نہیں تو یہ عقد صحیح اور وعدہ لازم ’’وغایۃ الامر ان یکون الوعد السابق لازماً علی المشتری علی قول من یقول بلزوم الوعد‘‘(غیر سودی بینکاری ۲۵۴)

تبصرہ: اولاً: معلوم نہیں یہاں ’’قضاءً‘‘ کا لفظ کیوں نہیں بڑھایا گیا؟

ثانیاً: وہ ’’من یقول‘‘ کون ہیں جنہوں نے وعدہ سابق کو قضاءً لازم فرمایا ہے، صراحۃً ان کا نام اور قول درکار ہے۔

ثالثاً: وعدہ سابق کی بنیاد پر نقصان کے ضمان کا کون قائل ہے؟ جو مجوزین حضرات کا مدعا ہے، ان کا نام اور قول بھی ضروری ہے۔

رابعاً: جب جامع الفصولین کی عبارت سے یہ معلوم ہوگیا کہ شرط غیر معتبر ہے، تو وہ پھر لازم کیونکر ہوگئی؟

بحث کا خلاصہ اور تبصرہ

لکھا ہے :

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی بیع کے صلبِ عقد میں کوئی شرط نہ لگائی جائے لیکن عقد سے پہلے یا بعد میں اس کا ذکر وعدے کے طور پر کر دیا جائے تو اس سے بیع

فاسد نہیں ہوتی اور نہ ’’صفقه فی صفقه‘‘ لازم آتا ہے الخ۔

(غیر سودی بینکاری صفحہ/۲۵۴)

تبصرہ: یہ خلاصہ عباراتِ صریحہ کے خلاف ہے، صحیح بات جو عباراتِ فقہیہ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جو عقد سابق شرط کی بنیاد پر ہوا ہے خواہ وہ سابق شرط اور وعدہ کا تلفظاً ذکر بوقت عقد ہوا ہے یا نہیں، ہر دو صورتوں میں یہ عقد مشروط اور بیع معلق اور صفقہ فی صفقہ ہے۔ البتہ جہاں شرطِ سابق سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عقد کیا گیا ہو وہ عقد صحیح ہے، البتہ اس صورت میں شرطِ سابق غیر معتبر اور غیر لازم ہے، جیسا کہ تفصیل سے گزر چکا ہے۔ لہٰذا عقد سے قبل شرط اور وعدہ کو لازم قرار دینا صریح عبارات کے خلاف ہے، ہاں عقد کے بعد وعدہ کے لزوم کی عبارت موجود ہے، جس کا کسی کو انکار نہیں۔

عقد سے قبل یکطرفہ وعدے کا حکم:

مجوزین حضرات کی کوشش یہ ہے کہ یکطرفہ وعدے کو قضاءً لازم فرما دیں، اور مرابحہ و اجارۂ بنوکیہ میں جو عقد سے قبل یکطرفہ وعدے کئے جاتے ہیں وہ دیانۃً اور قضاءً درست اور جائز ہو جائیں، لیکن بہت کچھ لکھنے کے باوجود مدعا ثابت ہوتا نظر نہیں آتا، تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

﴿۱﴾ وعدہ سے متعلق تفصیلی بحث کے آخر میں بطور خلاصۂ بحث تحریر ہے:

’’وعدہ کا ایفاء عام حالات میں صرف دیانۃً واجب ہوتا ہے قضاءً نہیں، اگر کوئی شخص بغیر کسی عذر کے وعدہ خلافی کرے تو گنہگار ہے اور اگر وعدہ کرتے ہوئے ہی نیت وعدہ خلافی کی ہو تو اسے حدیث میں نفاق فرمایا گیا ہے‘‘ (غیر سودی بینکاری ۱۵۷)

تبصرہ: یہ فیصلہ مشہور، اکثر اور راجح کے خلاف ہے۔ لکھا ہے:

(۱) عام طور سے حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا جو مشہور مذہب ہے وہ یہ ہے کہ وعدے کا

پورا کرنا واجب نہیں بلکہ مستحب ہے اور مکارم اخلاق میں سے ہے بعض مالکیہ کا بھی یہی قول ہے (عمدۃ القاری ۱۲/۱۲۱، مرقاۃ ۴/۶۵۳، اورالاذکار للنووی ۲۸۲) یہ حضرات فرماتے ہیں کہ وعدہ خلافی کو احادیث میں جو نفاق یا نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے وہ اس وقت ہے جب کسی شخص کے دل میں وعدہ کرتے وقت ہی یہ بدنیتی ہو کہ وہ اس کو پورا نہیں کرے گا لیکن اگر یہ بدنیتی نہ ہو پھر اتفاقاً وعدہ خلافی ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔(غیر سودی بینکاری ۱۳۸)

تبصرہ: اس رائے کے بعد تین اور مذاہب بھی لکھے ہیں لیکن مشہور، جمہور اور اکثر کا مذہب یہی ہے کہ عام حالات میں وعدہ پورا کرنا مستحب ہے الخ لیکن پھر نتائج بحث کے تحت اس کے خلاف قلیل اور غیر مشہور قول کو لیکر قضاءً واجب لکھتے ہیں۔

﴿۲﴾ لکھا ہے:

بعض معاملات میں حاجت کی وجہ سے یک طرفہ وعدے کو قضاءً بھی لازم کیا جا سکتا ہے(غیر سودی بینکاری ۱۵۸)

اسی طرح صفحہ ۱۴۸ پر لکھتے ہیں:

البتہ مالی معاملات میں جہاں حاجت داعی ہو وعدوں کو قضاءً بھی لازم کیا جا سکتا ہے جس کی ایک مثال بیع الوفاء کی صورت میں پیچھے گذری......اور اس موقع پر فقہاء کرام نے اس بات کو بیع الوفاء کے ساتھ مخصوص رکھنے کے بجائے یہ کہہ کر اسے فی الجملہ عموم عطا کیا ہے کہ:''**اذ المواعید قد تکون لازمة فیجعل لازمة لحاجة الناس**''

تبصرہ: ان دونوں عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بیع الوفاء کی صورت میں لزوم وعدہ سے بوقتِ مرابحہ واجارہ یکطرفہ وعدے کے قضاءً لزوم اور جواز پر استدلال کیا گیا ہے ...... یاد رکھیئے! یہ استدلال بھی راجح، مشہور اور اکثر کے خلاف ہے کیونکہ بیع الوفاء میں عقد

سے قبل یا بوقتِ عقد یا بصورتِ تصادق یہ وعدہ مفسد عقد ہے اور جامع الفصولین میں بدوں ذکر و تصادق اگرچہ اس کو مفسد عقد تو نہیں فرمایا گیا لیکن اس شرط کا اعتبار بھی نہیں کیا گیا یعنی ایسی صورت میں اس شرط کا نبھانا ضروری نہیں، جیسا کہ اوپر تفصیل سے گزر چکا ہے، نیز بیع الوفاء سے ہٹ کر دوسرے عقود میں یکطرفہ وعدے کو قضاءً لازم قرار دینا بھی اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کی تصریحات کے خلاف ہے۔ نیز حضرت مفتی اعظم پاکستان قدس سرہ نے تو یکطرفہ وعدہ کے قضاءً لزوم کو مطلقاً رد فرمایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

مگر یکطرفہ وعدہ کو عدالت کے ذریعے جبراً پورا نہیں کرایا جا سکتا ہے۔

(معارف القرآن ۴۸۰/ ۵، بحوالہ غیر سودی بینکاری ۱۵۷)

تبصرہ: معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ کے بھی خلاف ہے، کیونکہ حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ بیع سے قبل وعدہ کو مفسد سمجھتے ہیں اور بعد العقد وعدہ کو لازم تو سمجھتے ہیں پر قضاءً نہیں، جبکہ کتاب میں دونوں باتوں میں مخالفت ہے اور یہ مخالفت مجبوری بھی ہے کیونکہ اس کے بغیر بینک آدھا دن بھی نہ چلے گا۔

نیز **قد تکون الخ** میں قد تقلیل کے لئے ہے، لہٰذا اس کو عموم دے کر قانون بنانا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

(۳) لکھا ہے:

اگر کسی خلاف شرع بات کا کوئی وعدہ کیا گیا ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں مثلاً ایک شریک دوسرے شریک سے یہ وعدہ کرے کہ اگر کاروبار میں کوئی نقصان ہوگا تو میں اس کی تلافی کر کے تمہیں دونگا تو یہ وعدہ بھی چونکہ سارا نقصان ایک فریق پر ڈالنے کا موجب ہے جو شرعاً جائز نہیں اس لئے یہ وعدہ بھی جائز نہیں (غیر سودی بینکاری صہ ۱۵۸)

تبصرہ: ان نام نہاد اسلامی بینکوں میں یہ ناجائز وعدے بھی ہوتے ہیں۔ بندہ کو مولانا

عدنان کاکاخیل صاحب نے بتایا کہ نقصان کی صورت میں بینک ہدیہ دیتا ہے......جس پر بندہ نے اسی وقت کہا کہ یہ ہدیہ ہے یا رشوت؟

بندہ نے پوچھا: کیوں دیتا ہے؟

کہا: ورنہ شرکاء رقم نکال لیں گے۔

اسی طرح مولانا فیصل احمد صاحب (استاذ بینکنگ جامعۃ الرشید) نے بھی بتایا کہ کاغذات وتحریرات میں تو یہ بات نہیں ہوتی البتہ زبانی یا عملی طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔

کیا زبان تحریر سے کمزور ہوتی ہے؟ لوگ تو زبان سے سن کر ہی اعتماد کرتے ہیں کیونکہ شریعت میں معاملات وعقود کے لئے تحریر ضروری نہیں، زبان کافی ہے، بلکہ تحریر تو زبان ہی کی نیابت کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

الحاصل جس طرح سودی بینکوں میں رقم لگانے والا نقصان کے تصور کے بغیر صرف نفع ہی نفع کی بنیاد پر رقم جمع کرتا ہے یہاں بھی سیونگ اکاؤنٹ میں نقصان کے تصور کے بغیر نفع ہی کے لئے رقم جمع کراتا ہے اور بس۔ اور بینک والے بھی اس کے اس تصور کا خیال رکھتے ہیں کہ نقصان کی صورت میں رشوت دیتے ہیں، اور اس کا نام ہدیہ رکھتے ہیں، تاکہ اس کا اسلامی تجارتی تصور قائم نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ پوچھنے کے وقت کہتے ہیں کہ دوسرے بینک لاکھ پر اتنا نفع دیتے ہیں اور اسلامی بینک اتنا دیتے ہیں، آج تک کسی ایک نے بھی شاید کسی سے یہ نہ پوچھا ہوگا کہ نقصان کی صورت میں ہمارے ذمہ کتنا نقصان آئے گا؟ اور کیوں پوچھے؟...... جب نقصان کا تصور ہے ہی نہیں!

نیز یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ کیا اسم کی تبدیلی سے (یعنی رشوت کا نام ہدیہ رکھنے سے) مسمیٰ بھی تبدیل ہو جائے گا؟

(۴) لکھتے ہیں:

تجارتی معاملات میں وعدے کے قضاءً لازم ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ اس کے قضاءً لازم ہونے پر فریقین وعدے کے وقت ہی متفق ہو جائیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی وعدے کے قضاءً لازم ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا یہ مطلب تو واضح ہے کہ وعدے کرنے والے کو عدالت اس بات پر مجبور کرے گی کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے لیکن مجمع الفقہ الاسلامی میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آئی کہ موجودہ دور میں جبکہ عدالتی کارروائی میں اتنا طویل وقت اور اتنا کثیر سرمایہ خرچ ہوتا ہے کہ بعض اوقات عدالتی دادرسی نا قابل عمل ہو جاتی ہے، وعدے کے قضاءً لازم ہونے کا کم از کم نتیجہ یہ بھی ہونا چاہیئے کہ اگر کسی وجہ سے وہ وعدہ پورا نہ کرے تو وعدہ خلافی کے نتیجہ میں موعود لہ کو جو حقیقی نقصان ہوا ہو اس نقصان کی تلافی کرے الخ (غیر سودی بینکاری ص ۱۵۸)

تبصرہ: اس عبارت میں دو باتیں دلائل اور ثبوت کے بغیر لکھی گئی ہیں ایک یہ کہ ''قضاءً لازم ہونے پر فریقین وعدے کے وقت ہی متفق ہو جائیں'' جبکہ ما قبل کی تفصیل میں کتاب دیکھی جائے تو اس کا کہیں بھی بیان نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ ''قضاءً لازم ہونے'' کا صریح اور اصل مصداق یہ ہے کہ عدالت کے ذریعے اس پر جبر کیا جائے، کو چھوڑ کر اپنی طرف سے ایک نیا مطلب ایجاد کیا گیا، چونکہ یہ مطلب اصل اور حقیقت کے بالکل خلاف اور نا جائز طور پر ایک کا مال دوسرے کو کھلانے کی تدبیر ہے جس کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں، اس کے ثبوت کے لئے جن دو باتوں کو پیش فرمایا ہے وہ دونوں نا کافی ہیں۔

پہلی بات: حدیث ''لا ضرر و لا ضرار'' (نہ کوئی شخص دوسرے کو نقصان پہنچائے اور نہ دو آدمی ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں) کو پیش فرمایا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس ماہر شریعت مجتہد اور محقق کا نام بتایا جائے جنہوں نے اس حدیث سے استدلال کرتے

ہوئے فرمایا ہو کہ مشتری نے بائع سے بوقت عقد جو وعدے کئے ہیں اگر بلا عذر اس نے پورے نہ کئے اور بائع کو حقیقی نقصان ہوا تو اس نقصان کا مشتری ذمہ دار ہوگا۔لیکن یہ حوالہ ملے گا نہیں ورنہ ضرور نقل فرماتے ،اذ لیس فلیس

دوسری بات: ''فتح العلی المالک ۲۵۵/۱'' کے حوالے سے ایک لمبی عبارت ذکر فرمائی ہے جس سے مدعا کا ثبوت مشکل نہیں ناممکن ہے۔دیکھیے !

'' قال فی الرسم الأول من سماع أصبغ من جامع البيوع : قال أصبغ : سمعت اشهب ،وسئل عن رجل اشترى من رجل كرما فخاف الوضيعة فأتى ليستوضعه ، فقال له : بع وأنا أرضيك. قال: ان باع برأس ماله أو بربح فلا شئ عليه ،وان باع بالوضيعة كان عليه أن يُرضيه ،فان زعم أنه أراد شيئا سمّاه فهو ما أراد ،وان لم يكن أراد شيئا، أرضاه بما شاء وحلف بالله ماأراد أكثر من ذلك ،وان لم يكن أراد شيئا يوم قال ذلك ،قال أصبغ : وسألت عنها ابن وهب فقال : عليه رضاه بما يشبه ثمن تلك السلعة والوضيعة فيها.قال أصبغ : وقول ابن وهب هو أحسن عندى، وهو أحب الى اذا وضع فيها ،قال محمد بن رشد : قوله بعه وأنا أرضيك عِدَة الا أنها عدة على سبب ،وهو البيع، والعدة اذا كانت على سبب لزمت بحصول السبب فى المشهور من الأقوال. وقد قيل : انها لا تلزم بحال، وقيل : انها تلزم على كل حال، وقيل : انها تلزم اذا كانت على سبب، وان لم يحصل السبب، وقول أشهب : ان زعم أنه أراد شيئاً سماه فهو ما أراد يريد مع يمينه، ومعناه اذا لم يسم شيئا يسيرا لا يشبه أن يكون أرضاه .'' الخ.

(غیر سودی بینکاری ۱۵۹،۱۶۰)

اصبغ فرماتے ہیں کہ اشہب رحمہ اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا ایک ایسے شخص کے بارے میں جس نے کسی سے انگور خریدے پھر اس کو نقصان کا ڈر ہوا تو وہ واپس بائع کے پاس آیا کہ اس سے کچھ رعایت کروالے بائع نے کہا کہ تم خریدلو اگر کچھ نقصان ہوا بھی تو میں تمہیں راضی کرلوں گا، تو اشہب نے فرمایا کہ اگر اس خریدار نے اصل سرمایہ کے بدلے میں آگے بیچا ہو یا کچھ منافع کے ساتھ تو بائع پر کوئی چیز لازم نہیں اور اگر نقصان کے ساتھ آگے بیچا تو بائع کے ذمہ ہے کہ وہ خریدار کو راضی کرے، پھر اگر بائع کا یہ خیال ہو کہ اس نے کسی مقررہ چیز کا ارادہ کیا تھا تو پھر وہی چیز خریدار کو دے گا، اور اگر کچھ ارادہ نہیں کیا تھا تو پھر جس چیز سے چاہے خریدار کو راضی کرے، اور اللہ کی قسم اٹھائے کہ میں نے اس سے زیادہ کا ارادہ نہیں کیا تھا اگرچہ جس دن اس نے یہ بات کہی تھی اس دن بھی کسی چیز کا ارادہ نہ کیا ہو۔

اصبغ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن وہب سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ بائع کے ذمہ ہے کہ وہ خریدار کو اس سامان یا اس میں ہونے والے نقصان کی قیمت کے بقدر دے کر راضی کرے، اصبغ فرماتے ہیں کہ ابن وہب کا قول میرے نزدیک زیادہ بہتر ہے اور نقصان کی صورت میں یہی قول مجھے پسند ہے محمد ابن رشد فرماتے ہیں کہ بائع کا یہ کہنا کہ ''تم اس کو خریدلو اگر نقصان ہو گیا تو میں تمھیں راضی کرلوں گا'' یہ ایک وعدہ ہے لیکن یہ ایک سبب پر مبنی ہے جو کہ بیع ہے اور وعدہ جب کسی سبب پر مبنی ہو تو مشہور قول کے مطابق اس کا پورا کرنا لازم ہوتا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وعدہ کسی بھی حال میں لازم نہیں ہوتا، بعض کا قول ہے کہ ہر حال میں لازم ہوتا ہے، بعض کا قول یہ ہے کہ وعدہ جب کسی سبب پر ہو تو اگرچہ وہ سبب حاصل نہ ہو تو بھی لازم ہوتا اور اشہب کا یہ قول کہ ''اگر بائع کا خیال یہ ہو کہ اس نے کسی مقررہ چیز کا ارادہ کیا تھا تو پھر وہی چیز خریدار کو دے گا'' تو ان کی مراد یہ ہے کہ یہ قسم کے ساتھ ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اگر اس نے یہ معمولی چیز بھی

مقرر نہ کی ہو یہ اس طرح نہیں ہے کہ وہ اس کو راضی بھی کر لیتا ہے ﴾

تبصرہ: اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ بائع اپنی طرف سے مشتری کے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہے کہ مال خریدو، نقصان ہوا تو راضی کروں گا یعنی کچھ ثمن چھوڑ دوں گا یا واپس کر دوں گا اور اس میں بھی یہ ضروری نہیں کہ پورا نقصان دے بلکہ جتنا اس نے دل میں خیال کیا تھا اتنا ہی اس کے ذمہ ہے البتہ اگر دل میں ارضاء کہنے کے وقت کچھ خاص مقدار ذہن میں نہ تھی تو پھر اس میں تفصیل ہے جو اس عبارت میں الی آخرہ بیان کی گئی ہے۔

تبصرہ: **اولاً:** تو اس جزئیہ اور زیر بحث مسئلہ جس کے ثبوت کے لئے اس جزئیہ کو تلاش کر لایا گیا ہے، میں دو فرق ہیں:

پہلا فرق: اس جزئیہ میں بائع کو ضامن ٹھہرایا گیا ہے اور ہمارے مسئلہ میں مشتری کو ضامن ٹھہرایا جاتا ہے، لہٰذا یہ جزئیہ صریح مستدل نہ ہوا۔

دوسرا فرق: یہ کہ اس جزئیہ میں بائع بدوں کسی دباؤ اور اشتراط، مشتری کے لئے اپنی طرف سے ارضاء کا وعدہ کرتا ہے جبکہ ہمارے مسئلہ میں متعدد شرائط کے ذریعہ مشتری کو جکڑ کر ضمان کا پابند بنایا جاتا ہے۔ جبر و اکراہ اور اختیار و رضاء کے اس بنیادی اور بدیہی فرق کے باوجود اس جزئیہ سے استدلال بداہت کا انکار ہے۔

ثانیاً: یہ جزئیہ مذاہب اربعہ کا متفق علیہا جزئیہ نہیں ورنہ ضرور ہر مذہب سے حوالہ پیش فرماتے، اذ لیس فلیس، تو یہ بھی ایک شاذ بات ہوئی۔

ثالثاً: جس مذہب کی کتاب میں یہ جزئیہ ہے اس مذہب میں بھی یہ کوئی متفق علیہ جزئیہ نہیں، بلکہ اس مذہب کے بعض یعنی ایک دو ہی کا قول ہے ورنہ وہ عبارت بتلائی جائے جس میں اس کا ذکر ہو کہ یہ مذہب کا اتفاقی مسئلہ ہے، اذ لیس فلیس۔ لہٰذا اس کے شذوذ میں اور ترقی اور اضافہ ہوا۔ یہی بات اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ مجوزین حضرات کا بنایا ہوا پورا ڈھانچہ

مرجوح، ضعیف اور شاذ اقوال پر قائم ہے۔

فتح العلی المالک کی عبارت میں آگے محمد بن رشد کی درج ذیل عبارت:

قال محمد بن رشد: قوله: بعه و أنا أرضيك عدة الا انها عدة على سبب الخ . (غیر سودی بینکاری ص۱۵۹)

بھی مدعا کے اثبات میں مفید نہیں کیونکہ اس عبارت میں وعدہ کے لزوم وعدم لزوم کی تفصیل اور اختلاف کا بیان ہے لیکن قضاءً لزوم کا ذکر اس عبارت میں بھی نہیں۔

الحاصل! مشتری سے جو وعدے لئے جاتے ہیں:

اولاً: تو یہ جبری وعدے ہیں۔

ثانیاً: قضاءً بھی لازم مانے جاتے ہیں۔

ثالثاً: نقصان کا ضامن گاہک کو بناتے ہیں۔

جبکہ اس عبارت سے یہ باتیں ثابت نہیں ہوتیں۔

﴿مرابحہ بنوکیہ اور خلاف شرع امور﴾

مرابحہ بنوکیہ کی صورت:

درج ذیل امور کی پابندی کے ساتھ مرابحہ بنوکیہ وجود میں آتا ہے:

(۱) کل لاگت کی تعیین کر دی جاتی ہے مثلاً ایک کروڑ کی روئی یا کپاس۔

(۲) اس پر مثلاً ۳۰ لاکھ نفع ہمیں دینا ہوگا۔

(۳) ۲۰ لاکھ مثلاً ایڈوانس اس قیمت میں سے پیشگی دینا ہوگا۔

(۴) ہمارا وکیل بن کر پہلے آپ کو ہمارے لیے مطلوبہ مال خریدنا ہوگا۔

(۵) ہمارے لیے خریدنے کے بعد فوراً ہم سے خریدنا ہوگا۔

(۶) اگر فوراً نہ خریدا تو کسی ثالث کو بیچنے اور نیلامی کی صورت میں ہونے والا حقیقی نقصان آپ کے ذمہ ہوگا۔

(۷) قبضہ امانت بدلنے کے لیے صرف اختیار تصرف کافی ہے۔

(۸) تاخیر قسط کی صورت میں التزام تصدق (کے نام سے جرمانہ) جمع کرانا ہوگا۔

وجوہِ فساد:

(۱) وعدہ کی بنیاد پر خریداری پر مجبور کرنا۔

(۲) عدم خریداری کی صورت میں مالی نقصان اور جرمانہ ڈالنا۔

(۳) عیب کی صورت میں رد اور عدم خریداری کا حق نہ دینا۔

(۴) قبضۂ امانت کی قبضۂ ضمان میں بدوں تجدیدِ قبض تبدیلی۔

(۵) تاخیر قسط کی صورت میں التزام تصدق کے نام سے جرمانہ لینا۔

(۶) مبیع کا بینک کے ضمان میں نہ آنا۔

خلافِ شرع امر نمبر۱: وعدہ کی بنیاد پر خریداری پر مجبور کرنا:

اس کی تفصیل ماقبل میں کار اجارہ کی وجوہِ فساد میں سے ’’خلافِ شرع امر نمبر۵: الصفقۃ فی الصفقۃ‘‘......اور......’’عقد سے قبل یکطرفہ وعدے کا شرعی حکم‘‘ عنوان کے تحت تفصیلاً ملاحظہ فرمائیں۔

خلافِ شرع امر نمبر۲: عدم خریداری کی صورت میں مالی نقصان اور جرمانہ ڈالنا:

بینک سے مطلوبہ مال نہ خریدنے کی صورت میں ہونے والا نقصان گاہک پر بطور جرمانہ ڈالنے کی بنیاد بھی......وعدے کو لازم سمجھنے پر ہے جس کی تفصیل ماقبل میں کار اجارہ کی وجوہِ فساد میں سے ’’خلافِ شرع امر نمبر۵: الصفقۃ فی الصفقۃ‘‘......اور......’’عقد سے قبل یکطرفہ وعدے کا شرعی حکم‘‘ عنوان کے تحت تفصیلاً ملاحظہ فرمائیں۔

خلافِ شرع امر نمبر۳: عیب کی صورت میں رد اور عدم خریداری کا حق نہ دینا:

گاہک کا بینک کی وکالت میں خریداری کرنا یہ الگ عقد ہے اور پھر گاہک کا بینک سے خریداری کرنا الگ عقد ہے، اور گاہک پہلے عقد میں بینک کا وکیل تھا لیکن بینک سے خریداری کے وقت گاہک مشتری ہے، لہٰذا اِس بیع کے وقت گاہک کو وہ تمام خیارات حاصل ہوں گے جو ایک مشتری کو حاصل ہوتے ہیں حتیٰ کہ اگر گاہک چاہے تو عیب کی وجہ سے وہ سامان رد کر کے خریداری سے انکار بھی کر سکتا ہے۔

گاہک کو ملنے والے اس اختیار کا ذکر صراحۃً حضرت حکیم الامۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتویٰ میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’سوال (۳۶): زید نے عمرو سے کہا میں تم کو روپیہ دیتا ہوں اور تمہارے لانے کی

اور بار برداری کی اجرت اور کرایہ دیتا ہوں تم میرے اجیر بن کر مال لادو تاکہ پھر تم اس مال میں نقص نہ بتاؤ۔

الجواب: اس کہنے سے عمرو کا حق مال کو ناقص بتلانے کا وقت بیع مرابحہ فیما بینہما زائل نہیں ہوا عمرو کو مثل مشتری اجنبی کے تمام حقوق حاصل ہیں البتہ زید کو یہ اختیار ہے کہ جس وقت عمرو اجیر وکیل ہونے کی حیثیت سے مال لایا ہے اگر ناقص مال لانے سے منع کردیا تھا تو ناقص ہونے کی صورت میں عمرو سے بوجہ مخالفت کرنے کے روپیہ لے لے مگر جب مال کو قبول کرلیا تو زید کو تو کوئی حق نہیں رہا مگر عمرو کو یہی حق حاصل ہے۔''

(امداد الفتاوی ۳/۱۴۱)

خلافِ شرع امر نمبر۴: قبضۂ امانت کی قبضۂ ضمان میں تبدیلی:

کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں اس عنوان کے تحت ہندوستان کے ایک معروف عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد زید باندوی صاحب مدظلہ کے ایک مقالے، جس میں انہوں نے غیر سودی بینکوں میں مرابحہ پر بحث کی ہے، سے مفصل تحریر جو قبض سے متعلق ہے، نقل فرمائی گئی ہے۔ پہلے پوری تحریر ملاحظہ فرمائیں:

تجدید قبض کی بحث

البتہ مذکورہ بالا صورت میں یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ وکیل بالشراء نے جب سامان خریدا اور موکل (ادارہ) کی طرف سے بھی قبضہ کرلیا تو ظاہر ہے کہ یہ قبضہ بر بناء وکالت موکل کی طرف سے ہوا...... اور یہی وکیل جب اسی سامان کو ادارے سے خریدے گا تو مشتری ہوگا اور ادارے کی حیثیت بائع کی ہوگی۔

اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وکیل بالشراء کا مبیع پر سابق قبضہ (جو بحیثیت وکیل تھا) حادث قبضہ کے لئے کافی ہوگا یا نہیں جواَب بحیثیت مشتری کے ہوگا۔

﴿قبضہ کے اقسام﴾

اس سلسلہ میں فقہاء کرام نے جو ضابطہ تحریر فرمایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ قبضہ کی دو قسمیں ہیں: قبضہ امانت، قبضہ ضمان، پھر قبضہ ضمان کی دو قسمیں ہیں: ضمان بنفسہ، ضمان لغیرہ۔ ہر ایک کا حکم جداگانہ ہے۔

۱۔ مشتری کو اگر مبیع پر پہلے سے قبضہ حاصل ہے اور وہ قبضہ ضمان بنفسہ کا ہے، مثلاً غاصب کا قبضہ شے مغصوب پر۔ اس کا حکم یہ ہے کہ مبیع موجود ہو یا نہیں، بہرحال سابق قبضہ جدید قبضہ کے لئے کافی ہوگا اور تجدیدِ قبضہ کی ضرورت نہ ہوگی، کیونکہ غاصب کا قبضہ ضمان بنفسہ ہے اور مغصوب شے بہرصورت مضمون بنفسہ ہے۔

۲۔ اور اگر مبیع پر مشتری کا قبضہ ضمان لغیرہ کا ہے، مثلاً شے مرہون پر راہن کا قبضہ، کیونکہ درحقیقت رہن امانت ہوا کرتا ہے البتہ مضمون بالغیر (یعنی قرض کی وجہ سے) ہوتا ہے۔ گویا یہ مضمون بنفسہ نہیں بلکہ بالغیر ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شے مرہون موجود ہو تب تو یہ قبضہ جدید قبضہ کی طرف سے کافی ہوگا ورنہ نہیں۔

۳۔ اور اگر مبیع پر مشتری کا قبضہ قبضہ امانت ہے مثلاً عاریت، ودیعت، وکالت، اجارہ کا قبضہ، کہ یہ سارے قبضے قبضہ امانت کہلاتے ہیں۔

ان کا حکم یہ ہے کہ یہ امانت والے قبضے ضمان والے قبضہ (یعنی بیع کے لئے) کافی نہ ہوں گے بلکہ تجدیدِ قبضہ شرط ہے۔ یہ ساری تفصیل شرح وبسط کے ساتھ بدائع الصنائع میں منقول ہے۔

وَجُملَةُ الكَلامِ فِيهَا أَنَّ يَدَ المُشتَرِى قَبلَ الشِّرَاءِ إمَّا أَن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ وَإمَّا أَن كَانَت يَدَ أَمَانَةٍ فَإن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ فَإمَّا أَن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ بِنَفسِهِ وَإمَّا أَن كَانَت يَدَ ضَمَانٍ بِغَيرِهِ ... الى أن قال ... وَإن

كَانَت يَدُ المُشتَرِى يَدَ أَمَانَةٍ كَيَدِ الوَدِيعَةِ وَالعَارِيَّةِ لا يَصِيرُ قَابِضًا (بدائع الصنائع ج /۵ص ۲۴۸)

مذکورہ بالاتفصیل کے پیش نظر جب وکیل بالشراء کا قبضہ کرنا قبضہ امانت ہے نہ کہ قبضہ ضمان، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ قبضہ (جو بحثیت وکیل تھا) جدید قبضہ کے لئے کافی نہ ہو جواَب بحثیت مشتری ہوگا بلکہ تجدید قبضہ شرط قرار دیا جائے۔ واللہ أعلم

اس لئے بہتر صورت یہ ہے کہ ادارہ کا آدمی خود مبیع پر قبضہ کرے اور دوبارہ پھر یہ مشتری جدید معاملہ کر کے بحثیت مشتری قبضہ کرے۔ واللہ أعلم

لیکن اگر ایسا نہیں کیا جاتا بلکہ مشتری سابق قبضہ پر کفایت کرتا ہے تو یہ معاملہ درست ہوگا یا نہیں اس میں کچھ تفصیل ہے۔

﴿قبضہ وتسلیم کی حقیقت﴾

وہ یہ کہ شرعی قبضہ کا یہ مطلب نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہاتھوں سے پکڑ لے یا مبیع کو منتقل کر کے اپنے مقام پر لے آئے۔

قبضہ کی یہ تفسیر دوسرے ائمہ شافعیہ وغیرہ کے یہاں تو ہے۔

وَقَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللَّهُ : القَبضُ فِي الدَّارِ وَالعَقَارِ وَالشَّجَرِ بِالتَّخلِيَةِ .وَأَمَّا فِي الدَّرَاهِمِ وَالدَّنَانِيرِ فَتَنَاوُلُهُمَا بِالبَرَاجِمِ وَفِي الثِّيَابِ بِالنَّقلِ (بدائع ج ۵ / ۲۴۴)

لیکن فقہاء احناف کے نزدیک شرعی قبضہ کا مفہوم وسیع ہے۔ ان کے نزدیک قبضہ کا حاصل صرف تخلیہ ہے، اور تخلیہ کا حاصل یہ ہے کہ بائع اور مشتری کے درمیان باعتبار حقیقت یا باعتبار عرف و عادت کے ایسا کوئی مانع اور حائل نہ ہو جو عرفی قبضہ اور تصرف کرنے سے مانع ہو بلکہ مبیع اس حال میں ہو کہ مشتری اگر اس میں تصرف کرنا چاہے تو آزادی کے ساتھ تصرف کر سکے گو مبیع ابھی بائع کے پاس ہی موجود ہو۔

وَأَمَّا تَفسِيرُ التَّسلِيمِ وَالقَبضِ فَالتَّسلِيمُ وَالقَبضُ عِندَنَا هُوَ التَّخلِيَةُ وَالتَّخَلِّى وَهُوَ أَن يُخَلِّىَ البَائِعُ بَينَ المَبِيعِ وَبَينَ المُشتَرِى بِرَفعِ الحَائِلِ بَينَهُمَا عَلَى وَجهٍ يَتَمَكَّنُ المُشتَرِى مِن التَّصَرُّفِ فِيهِ فَيُجعَلُ البَائِعُ مُسَلِّمًا لِلمَبِيعِ وَالمُشتَرِى قَابِضًا لَهُ. (بدائع ج ۵ /ص ۲۴۴)

لِأَنَّ مَعنَى القَبضِ هُوَ التَّمكِينُ وَالتَّخَلِّى وَارتِفَاعُ المَوَانِعِ عُرفًا وَعَادَةً وحَقِيقَةً (بدائع ج ۵ / ۱۴۸)

وَلِهَذَا كَانَت التَّخلِيَةُ تَسلِيمًا وَقَبضًا فِيمَا لَا مِثلَ لَه .

(بدائع ج ۵ / ص ۲۴۴)

قبضہ کی اگر مذکورہ بالاتفسیر کو پیش نظر رکھا جائے جس کا حاصل بائع کی جانب سے تسلیم اور مشتری کی جانب سے قدرت ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس طرح کا قبضہ مندرجہ بالا صورت میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وکیل بالشراء (جو بعد میں مشتری بن رہا ہے) جس کے قبضہ میں مبیع موجود ہے (مفروضہ صورت مسئولہ میں) اس کی طرف سے تسلیم تو پائی جاتی ہے، اور ادارہ کو قدرت بھی حاصل ہوتی ہے، اگر ادارہ چاہے تو مبیع میں تصرف کرے اور وکیل بالشراء اس میں کچھ نہیں کرسکتا۔ اس لئے اس صورت میں ادارہ کا قبضہ تو حکماً ہو ہی گیا، کیونکہ تخلیہ پایا گیا (گو مبیع حقیقۃً وکیل بالشراء کے قبضہ میں ہے) اس کے بعد پھر اس کا قبضہ کرنا یہ گویا قبضہ ثانیہ ہے جو بحیثیت مشتری کے ہے۔ واللہ اعلم

اور مبیع کا وکیل کے پاس ہی موجود رہنا یہ ادارہ کے قبضہ کے منافی نہیں، بہت سی صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایک شے بائع کے پاس موجود ہے۔ لیکن معاملہ ہوجانے کے بعد مشتری کو اس پر قابض کہا جاتا ہے، مثلاً ذیل کے مسئلہ میں:

وَلَو اشتَرَى مِن إنسَانٍ كُرًّا بِعَينِهِ وَدَفَعَ غَرَائِرَهُ وَأَمَرَهُ بِأَن يَكِيلَ فِيهَا فَفَعَلَ صَارَ قَابِضًا سَوَاءٌ كَانَ المُشتَرِى حَاضِرًا أَو غَائِبًا ؛ لِأَنَّ المَعقُودَ

عَلَیـہِ مُعَیَّنٌ وَقَد مَلَکَہُ المُشتَرِی بِنَفسِ العَقدِ فَصَحَّ أَمرُ المُشتَرِی ؛ لِأَنَّہُ تَنَاوَلَ عَیناً ھُوَ مِلکُہُ فَصَحَّ أَمرُہُ وَصَارَ البَائِعُ وَکِیلًا لَہُ وَصَارَت یَدُہُ یَدَ المُشتَرِی .وَکَذٰلِکَ الطَّحنُ إذَا طَحَنَہُ البَائِعُ بِأَمرِ المُشتَرِی صَارَ قَابِضًا.(بدائع ج ۵ / ص۲۴۷)

اس لئے مذکورہ بالا تصریح کے پیش نظر یہ کہنے کی گنجائش نظر آتی ہے کہ اگر چہ مبیع وکیل بالشراء کے پاس موجود ہے، لیکن تسلیم وتمکین کی وجہ سے حکماً (نیا) قبضہ پایا گیا اسلئے یہ صورت بھی جائز ہونا چاہیے۔

جس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فقہاء نے قبضۂ امانت کو باوجودیکہ قبضۂ ضمان کے لئے کافی نہیں سمجھا، لیکن اس کے بعد ان الفاظ میں اس قسم کی صورتوں کا استثناء بھی فرمایا ہے جن میں حکماً قبضہ (قدرت تصرف) پایا جاتا ہے۔

لَا یَکُونُ قَابِضًا إلَّاإذَا ذَھَبَ المُودِعُ أَو المُستَعِیرُ إلَی العَینِ وَانتَھَی إلَی مَکَان یَتَمَکَّنُ مِن قَبضِھا فیصیر الآنَ قَابِضًا بِالتَّخلِیَۃِ .

(البحر الرائق ج/ ٦ ص ۸۷ ، شامی ج/ ۴ ص ۲ ۱ ۱)

لَا یَصِیرُ قَابِضًا إلَّا أَن یَکُونَ بِحَضرَتِہِ أَو یَذھَبَ إلَی حَیثُ یَتَمَکَّنُ مِن قَبضِہِ بِالتَّخَلِّی (بدائع ج ۵ / ص ۲۴۸)

غالبًا یہی وجہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے ثمن کے ادھار کے ساتھ بیع مرابحۃ کا جواز تجدید قبضہ کے بغیر اس صورت میں تحریر فرمایا ہے جس میں مال لانے والے کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے اور ظاہر بات ہے کہ وہ بھی قبضہ امانت ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’عمرو نے زید کو ۹۷ روپے مال لانے کے واسطے دیئے، اور تین روپے خریداری کی اجرت دی۔ زید نے مال خرید کر اپنے ہی مکان یا دکان پر اتارا، عمرو کے مکان دکان پر نہیں اتارا۔ عمرو نے مال منگوانے کے قبل شرط کر لی تھی کہ جس وقت تم ہمارا مال جوڑ وادو

گے ہم کو اختیار ہوگا، خواہ ہم تم کو دیں یا اپنے مکان پر لے جائیں اور تم کو نہ دیں، عمرو نے جوڑنے کے بعد زید سے دریافت کیا کہ یہ مال تم کس طرح خریدتے ہو؟ زید نے کہا پانچ ماہ کے لئے لیتا ہوں اور اٹھارہ روپے کے منافع سے دونگا۔

جواب: یہ بیع مرابحہ بتأجیل الثمن ہے اور بقیو دِ مذکورہ سوال درست ہے۔

(امداد الفتاوی ج/۳ص ۴۲،سوال ۳۹)

خلاصۂ کلام

یہ کہ صورتِ مسئولہ میں وکیل بالشراء کا اس مبیع کو مؤکل سے خرید لینے میں کوئی حرج نہیں اور ابتداءً اس کا قبضہ قبضۂ وکالت منجانب مؤکل تھا اور ثانیاً اس کا قبضہ بحیثیت مشتری تھا۔ تجدید قبضہ شرط ضرور ہے لیکن حکمی ومعنوی طور سے قبضۂ ثانیہ پایا جاتا ہے۔

اور جس طریقہ سے بائع مشتری کا وکیل بن سکتا ہے، اور یہ وکیل بنانا ہی قبضہ کے قائم مقام ہوتا ہے، جیسا کہ ماقبل کی بدائع کی عبارت میں گزرا، اسی طرح وکیل بالشراء کا مشتری بننا اور مؤکل کا بائع بننا بھی درست ہوگا۔ یعنی جس طریقہ سے وکالت اور بیع و شراء علی سبیل التعاقب بغیر کسی فصل وحقیقی تجدید قبضہ کے بغیر جمع ہو سکتے ہیں، اسی طرح یہاں بھی وکالت اور بیع وشراء بغیر کسی فصل وتجدید قبضہ کے جمع ہو جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

''(جدید فقہی مباحث، بحث المرابحۃ، مقالہ از مفتی محمد زید باندوی صاحب ج: ۳ص: ۴۸۳ تا ۴۸۸، طبع: ادارۃ القرآن)۔......(غیر سودی بینکاری صہ ۲۲۸ تا ۲۳۳)

اس تحریر سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وکیل بالشراء کا قبضہ (جس نے پہلے اس شیء پر بحیثیت وکیل اماناً قبضہ کیا تھا اب اس کا اپنے لئے قبضۂ ملک بدوں موکل کو لوٹائے) صحیح ہے۔

اَقول! اولاً: تو حضرت باندوی مدظلہ کی تعمیمِ قبض جو''قدرتِ تصرف'' کے عام مفہوم سے فرما چکے ہیں، یقین ہے کہ مجوزین حضرات کی علمی دیانت بھی اس کو ماننے سے

قاصر ہوگی۔

ثانیاً: اس تعمیم کے پیش نظر مبیع پر قبضہ کرنے سے پہلے مبیع کے ہلاک ہونے کا ضمان عادۃً کبھی بھی بائع پر نہیں آئے گا۔

ثالثاً: صفحہ نمبر ۲۳۲ پر بدائع کی جو عبارت علامہ باندوی مدظلہ نے نقل فرمائی ہے اس میں ’’و دفع غرائرہ‘‘ (اپنے تھیلے دے دیے) اور ’’الطحن‘‘ (پسوانا) کی شرط لغو ہونی چاہیے کیونکہ اس سے پہلے ’’قدرتِ تصرف‘‘ کے عام مفہوم سے قبضہ ہو چکا، اگر لغو نہیں تو یہ تعمیم باطل، اور امید ہے کہ حضرت مدظلہ بھی علامہ باندوی مدظلہ کے لحاظ میں بدائع کی شرط کو لغو نہیں فرمائیں گے۔

جب بدائع کی عبارت مفیدِ مدعا نہ رہی تو اب اس عبارت پر تفریع کرتے ہوئے یہ فرمانا:

> ’’اس لئے مذکورہ بالا تصریح کے پیش نظر یہ کہنے کی گنجائش نظر آتی ہے کہ اگرچہ مبیع وکیل بالشراء کے پاس موجود ہے لیکن تسلیم و تمکین کی وجہ سے حکماً (نیا) قبضہ پایا گیا اس لئے یہ صورت بھی جائز ہونی چاہیئے‘‘،

کسی طرح بھی درست نہ ہوگا۔

رابعاً: صاحب البحر اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارات سے بھی جو نتیجہ نکالا گیا ہے وہ بھی تسامح ہی تسامح ہے اور ظن غالب ہے کہ مجوزین حضرات میں سے کوئی بھی اس سے انکار نہیں فرمائیں گے۔ اگر صاحب بحر اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی اس عبارت سے ’’قدرتِ تصرف‘‘ کا عام مفہوم ثابت ہوتا تو ’’الا اذا ذهب المستعير الى العين‘‘ اور ’’انتهى الى مكان‘‘ کی شرط نہ ہوتی کیونکہ ان شرائط کے بغیر بھی تو ’’قدرتِ تصرف‘‘ بالمعنی العام پایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ علامہ ابن نجیم اور علامہ شامی رحمہما اللہ تعالیٰ کی عبارت بھی مُثبتِ مدعا نہیں، لہٰذا اس سے بھی اپنے مطلب کا نتیجہ نکالنا کسی طرح درست

نہیں۔

خامساً: آخر میں پیش کردہ بدائع کی عبارت بھی دعوی کے خلاف ہے کیونکہ ''**لا یکون قابضا الا أن یکون بحضرته**'' اور'' **أو یذهب الی حیث یتمکن من قبضه**'' کی شرط دعوے کی تردید کررہی ہے۔ کیونکہ قبض بمعنی ''قدرتِ تصرف'' ان شرائط کے بغیر بھی پایا جارہاہے تو بلا وجہ ان شرائط کا ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ ان کے ذکر کا فائدہ کیا ہے؟

سادساً: حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتوی کا جو مدار بتایا گیا ہے وہ بھی درست نہیں کیونکہ موکل نے جوڑنے (شمار کرنے) کے بعد زید سے دریافت کیا کہ یہ مال تم کس طرح خریدتے ہو الخ (غیر سودی بینکاری ۲۳۳)

تو موکل کا اپنے لئے شمار کرنا یہ اس کا قبضہ ہے لہٰذا اس سے اجیر کا اماناً قبضہ ختم ہو گیا اب بیع کے بعد جو قبضہ ہوگا وہ جدید قبضہ ہوگا۔

افسوس! اردو کی اتنی واضح عبارت اور پھر بھی حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ دیدہ دانستہ اتنی بڑی غلط بات لگانا کیونکر جائز ہوسکتا ہے؟

سابعاً: صفحہ نمبر ۲۳۳ پر'' خلاصۂ کلام'' کے تحت جو نتیجہ نکالا ہے وہ بھی بالکل غلط ہے کیونکہ بائع کا جو وکیل مشتری بنتا ہے اس میں ایک تو یہ ہے کہ بائع کا قبضہ قبضۂ ضمان ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وکیل کی حیثیت سے جب عمل کرے گا یعنی بوروں میں جب غلہ بھرے گا یا پسوائے گا تو قبضہ شمار ہوگا، جب موکل کے لئے یہ عمل کیا تو اس عمل کی وجہ سے قبضہ ہو گیا۔ اگر صرف وکیل بنانے سے قبضہ تام ہوتا تو عمل کی شرط نہ لگاتے، جبکہ صورتِ زیر بحث میں پہلا قبضہ قبضۂ امانت ہے نہ کہ قبضۂ ضمان اور دوسرا قبضۂ ضمان ہے، جو کہ پہلے سے قوی ہے اور بناء الضعیف علی القوی کی تو مثالیں ملتی ہیں جبکہ بناء القوی علی الضعیف کو ہر جگہ درست کہنا مشکل ہے۔

خلافِ شرع امر نمبر۵: تاخیر قسط کی صورت میں التزام تصدق کے نام سے جرمانہ لینا:

اس کی تفصیل ماقبل میں کاراجارہ کی وجوہِ فساد میں سے ''خلافِ شرع امر نمبر۴: ''تاخیر قسط وکرایہ کی صورت میں التزامِ تصدق کے نام سے مالی جرمانہ لگانا'' عنوان کے تحت تفصیلاً ملاحظہ فرمائیں۔

خلافِ شرع امر نمبر۶: مبیع کا بینک کے ضمان میں نہ آنا:

''مبیع کا بینک کے ضمان میں آنا'' کے عنوان کے تحت بینک اور خریدار کے مابین مرابحہ ایگریمنٹ کی وہ شق جس میں خریدار بینک سے مرابحۃً خریداری کا وعدہ کرتا ہے، کا ترجمہ کرتے ہوئے کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں تحریر ہے:

> ''ہم آپ سے وہ اثاثے فوراً مرابحہ کی بنیاد پر خرید لیں گے اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ کسی ایسے حقیقی نقصان کی ہم تلافی کریں گے'' جو وہ اثاثے کسی تیسرے فریق کو بیچنے کے نتیجے میں آپ کو پہنچے بشرطیکہ وہ متوقع نفع کا نقصان نہ ہو''۔
> (غیر سودی بینکاری صہ۲۲۴)

تبصرہ: یہ شرط کہ ''ہم آپ سے وہ اثاثے فوراً مرابحہ کی بنیاد پر خرید لیں گے اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ہم ذمہ داری لیتے ہیں کہ کسی ایسے حقیقی نقصان کی ہم تلافی کریں گے'' مفسد عقد ہے یا نہیں؟ فوراً کی مدت کیا ہے؟ یہ جہالت مفضیہ الی النزاع ہے یا نہیں؟ (بشرطیکہ کوئی حق بات سننے کے لئے تیار ہو ورنہ ظالم کی کوئی شرط بھی مفضی الی النزاع نہیں، کیونکہ مظلوم کو زبان ہلانے کی بھی اجازت نہیں)۔ آگے فرماتے ہیں:

> ''اب سنئے کہ اصل حقیقت کیا ہے؟ ...... اگر وہ وکیل کی تعدی کے بغیر ہلاک ہوجائے یا اس میں کمی آجائے تو نقصان بینک کا ہو''۔ (غیر سودی بینکاری ۲۲۵)

تبصرہ: فرماتے ہیں: کمی ہوجائے تو نقصان بینک کا ہو...... حالانکہ پہلے اصل عبارت میں فوراً خریدنے کی شرط کا حیلہ خود بینک کو اس مقصد کے لئے بتایا گیا ہے تاکہ اچانک کم ہونے کی صورت میں کمی کے نقصان سے بینک کو بچایا جائے۔

خریداری کے بعد ایجاب وقبول کے دستاویز کی شرعی حیثیت:

''مرابحہ کے وقت لاگت اور قیمت کا تعین'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

وکالۃً خریداری کے بعد باقاعدہ مشتری کی طرف سے ایجابِ بیع کے کاغذات جاتے ہیں اور پھر بینک اسے قبول کر کے فروخت کرتے ہیں اور دستخط ثبت کرتے ہیں اور پھر یہ کاغذات مشتری کو ملتے ہیں (ملخصاً من غیر سودی بینکاری ۲۲۱، ۲۲۲)

تبصرہ: اولاً: تو یہ پوچھنا ہے کہ یہ کاغذات ڈاک کے ذریعے بھیجے جاتے ہیں یا دستی؟

ثانیاً: اس دستاویز کی تکمیل کے لئے کوئی مدت شرط ہے یا نہیں؟

ثالثاً: اگر شرط ہے تو کمی بیشی کی صورت میں بیع اور مبیع کے ضمان پر کچھ اثر پڑیگا یا نہیں؟

رابعاً: وکالۃً خریداری کے ایجاب کے دستاویز کے جانے اور قبول کے دستاویز کے واپس آنے کے زمانے میں مبیع کہاں، کس کے قبضہ اور کس کے ضمان میں ہوتا ہے؟

خامساً: بینک نے جس بائع سے بواسطہ وکیل مال خریدا ہے، بینک کے بائع بننے کے بعد یہ مال بائع اول کے گودام اور شوروم میں امانۃً ہوتا ہے یا ضماناً؟ ان تمام تفصیلات کے بعد ایجاب وقبول کے دستاویز کی شرعی حیثیت صحیح طور پر معلوم ہوسکے گی۔

مرابحہ بنوکیہ اور مرابحہ شرعیہ میں واضح فرق:

مرابحہ شرعیہ شروط فاسدہ سے پاک اور ابتداء تا انتہاء شرعی جواز سے آراستہ اور حقیقی تراضیٔ جانبین پر مبنی ایک اسلامی عقد ہے، جبکہ مرابحہ بنوکیہ شروط فاسدہ سے آلودہ، شرعی جواز سے محروم اور جبری تراضی پر مبنی ایک غیر اسلامی عقد ہے۔

''مرابحہ کا عملی طریقۂ کار'' کے عنوان کے تحت کتاب ''غیر سودی بینکاری'' میں تحریر ہے:

''جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بینک کے پاس کوئی سامان موجود نہیں ہوتا بلکہ اس کے پاس جس چیز کا گاہک آتا ہے اسے خرید کر گاہک کو بیچتا ہے ظاہر ہے کہ اگر خرید کر اپنی ملکیت اور ضمان میں لاکر بیچے تو اس پر کوئی فقہی اشکال نہیں ہوسکتا، میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دیوبند میں یہی سوال پوچھا گیا تھا۔ یہ سوال وجواب درج ذیل ہیں:

سوال (۷۳۵) موجودہ وقت میں تجارت کا عام طور پر یہ قاعدہ ہورہا ہے کہ لوگ اپنے کو تاجر بتلاتے ہیں اور کسی کسی چیز کی تجارت بھی کرلیتے ہیں لیکن باقاعدہ دکان وغیرہ نہیں رکھتے جب کوئی فرمائش کسی شخص کی آتی ہے تو بازار سے مال خرید کر اس پر اپنا نفع قائم کرکے خریدار کو بھیج دیتے ہیں، کیا یہ منافع جائز ہیں؟

الجواب: اگر اس میں کوئی دھوکہ نہ کیا جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ یہاں کے بازار کا یہی نرخ ہے تو منافع جائز ہیں، البتہ بہت زیادہ نفع اس پر لگا کر بہت گراں فروخت کرنا مروت کے خلاف ہے اس لئے اچھا نہیں اور فتاوی بزازیہ میں بعض ائمہ حنفیہ (رحمہم اللہ تعالیٰ) سے زیادہ گراں فروخت کرنے کی کراہت نقل کی ہے۔''

(امداد المفتین ۸۴۴، بحوالہ غیر سودی بینکاری ۲۰۹، ۲۱۰)

تبصرہ: حضرت مفتی اعظم پاکستان رحمہ اللہ تعالیٰ نے جس سوال کا جواب دیا ہے اس سوال میں اور مرابحہ بنوکیہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے، تعجب ہے کہ اتنے بڑے فرق کو کیسے نظر انداز کیا گیا؟ مرابحہ بنوکیہ کا جواب امداد الفتاوی میں ہے، ذرا سوال و جواب دونوں ملاحظہ فرمائیں:

''سوال (۳۴): عمرو نے زید سے کہا تم مجھ کو یک صد روپیہ کا مال جفت پاپوش منگادو، میں تم سے ...... کا منافع دے کر ادھار ایک ماہ کے واسطے خرید کرلوں گا یا جس قدر

مدت کے واسطے تم دو گے اسی حساب سے منافع دوں گا یعنی پانچ روپے یک صدروپیہ کا منافع ایک ماہ کے واسطے ہے، جب مال آجاوے گا اس وقت مدت ادھار اور منافع کی متعین ہو جاوے گی۔ اس کے جواب میں زید نے کہا کہ میں منگا دوں گا مگر اطمینان کے واسطے بجائے یک صد کے دو صد کا رقعہ لکھاؤں گا تاکہ تم خلاف عہدی نہ کرو، عمرو نے منظور کیا؟

الجواب: اس میں دو مقام قابل جواب ہیں ایک یہ کہ زید و عمرو میں جو گفتگو ہوئی یہ وعدۂ محضہ ہے کسی کے ذمہ بحکم عقد لازم نہیں اگر زید کے منگانے کے بعد بھی عمرو انکار کردے تو زید کو مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں پس اگر عرف و عادت میں عمرو مجبور سمجھا جاتا ہو تو یہ معاملہ حرام ہے ورنہ حلال الخ'' (امداد الفتاوی ۳/۴۰)

تبصرہ: مرابحہ بنوکیہ ایسے وعدوں میں جکڑا ہوا ہے جن کا پورا کرنا بقول حضرت حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ لازم نہیں، بلکہ پورا کرنے کو لازم سمجھنا حرام ہے۔ مشتری کو نہ لینے کا حق ہوتا ہے، منافع میں کمی زیادتی کا اختیار ہوتا ہے اور ثمن واقعی سے زیادہ لینا حرام ہوتا ہے۔

تنبیہ: امداد المفتین کے سوال و جواب میں نہ اس قسم کی شروط کا ذکر ہے اور نہ ان کے حکم کا، جبکہ بینکوں کے مرابحہ میں یہ ساری شرطیں موجود ہیں۔ جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔

مرابحہ اور سودی قرض میں فرق:

اس عنوان کے تحت تحریر ہے:

''دونوں میں متعدد فرق ہیں جو درج ذیل ہیں۔

''(۱) سودی قرض میں بینک کو اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ قرض لینے والا اس قرض کو کہاں استعمال کرے گا۔ یہ قرض کسی بھی مقصد کے لئے لیا جا سکتا ہے چنانچہ بسا اوقات یہ قرض اپنے واجب الاداء بلوں کی ادائیگی کے لئے کبھی اپنے ملازمین کو تنخواہیں

دینے کے لئے اور کبھی اپنی ذاتی ضروریات میں خرچ کرنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔اس کے برخلاف مرابحہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب بینک کے گاہک کو واقعی کوئی چیز خریدنی ہو لہٰذا مرابحہ نہ بلوں کی ادائیگی کے لئے استعمال ہوسکتا ہے نہ تنخواہیں دینے کے لئے نہ اوور ڈرافٹ کے لئے یہ اسی صورت میں استعمال ہوگا جب واقعی کوئی خریداری مقصود ہو‘‘ (غیر سودی بینکاری صہ ۲۳۵)

تبصرہ: مرابحہ ان مقاصد کے لئے کیوں استعمال نہیں ہوسکتا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ بینک سے کوئی چیز مرابحہ پر لے اور جس سے بینک کا وکیل بن کر لیا تھا اسی کو واپس کر کے بینک کا دیا ہوا پیسہ لے کر ان مقاصد کے لئے استعمال کرے جیسے بیع عینہ والے کرتے ہیں بینک کو تو عینہ وغیرہ سے کوئی بھی تعلق نہیں بلکہ بینک کو تو مال کے کاغذات کے علاوہ اصل مال دیکھنے اور اس کے موجود ہونے کی بھی نہ ضرورت نہ حاجت۔

نیز یہ بھی عین ممکن ہے کہ کسی فیکٹری میں مال پڑا ہوا موجود ہو لیکن تنخواہوں کی رقم موجود نہ ہو اور اس کے کئی شریک ہوں جن میں سے بعض عارضی طور پر بینک سے رقم وصول کرنے کے لئے پوری فیکٹری کے مالک بن چکے ہوں اور بعض مال کے مالک، اسی طرح وہ بینک سے پیسے نکلوا کر تنخواہوں وغیرہ دوسری ضرورتوں میں استعمال کریں......فرق صرف اتنا ہوگا کہ سودی بینک ان کاموں کے لئے براہ راست رقم دیتے ہیں اور یہ بالواسطہ......اور اس فرق کا اثر جواز اور عدم جواز پر کتنا پڑتا ہے؟ یہ اپنی جگہ ایک مستقل بات ہے، اگر اس کو سود سے بچنے کا حیلہ کہا جائے تو جائز اور سود کھانے کا حیلہ کہا جائے تو حرام! جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

’’اس لئے سود حاصل کرنے کے لئے کوئی حیلہ اور تدبیر اختیار کرنا ممنوع ہے، اور سود سے بچنے کے لئے تدبیر اختیار کرنا درست ہے‘‘

(فتاوی محمودیہ ۲۲۴ تا ۲۲۶ ط: قدیم، غیر سودی بینکاری ۲۰۶، ۲۰۷)

''(۳) مرابحہ میں چونکہ بینک کوئی چیز خرید کر بیچتا ہے، اس لئے وہ چیز پہلے اس کے ضمان میں آتی ہے، اور آگے بیچنے سے پہلے اگر وہ ہلاک ہوجائے تو نقصان بینک کو اٹھانا پڑتا ہے، جبکہ سودی قرضوں میں بینک اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ اگر چہ عام طور سے بینک کے قبضہ میں اس چیز کے رہنے کا دورانیہ بہت مختصر ہوتا ہے''۔

(غیر سودی بینکاری/۲۳۶)

تبصرہ: دونوں میں عادۃً ہلاکت کا خطرہ نہیں ہوتا صرف امکانی احتمال کے درجہ میں اسلامی بینک میں ہلاکت کا خطرہ ہوگا کیونکہ یہ اختصار اتنا ہوتا ہے جس میں عادۃً ہلاکت کا احتمال نہیں ہوتا، اور شاید شرعاً یہ معتبر ہی نہ ہو۔

آگے فرماتے ہیں:

''لیکن بعض صورتوں میں یہ وقفہ کافی لمبا بھی ہوجاتا ہے اور ایسی صورتیں عملاً پیش آتی ہیں کہ بینک کو اس چیز کی تباہی کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے'' (حوالہ بالا)

تبصرہ: مجوزین حضرات نے بینک کو ہر چھوٹے بڑے نقصان سے بچانے کے لئے جو تدابیر بتلائی ہیں ان کے پیش نظر تو عملاً ایک بار بھی نقصان نہیں ہونا چاہیے...... جب چھوٹے نقصان سے بینک کو مکمل تحفظ دے چکے تو بڑے نقصان سے تو بطریق اولی تحفظ دے چکے ہونگے، بلکہ دے چکے ہیں، اور وہ اس طرح کہ ''تکافل'' کے نام سے بیمہ کو قائم فرمایا۔ بینک ''تکافل'' کا پورا خرچہ مع نفع/سود، گاہک ہی کے ذمہ ڈالتا ہے اور ہلاکت کی صورت میں تکافل سے وصول کرتا ہے تو بینک کو نقصان کب ہوتا ہے؟

''(۴) سودی قرضوں میں اگر مقروض شخص اپنا قرض ادا نہ کرے تو اس کا سود بڑھتے رہنے کی وجہ سے بینک کی آمدنی مسلسل بڑھتی جاتی ہے غیر سودی بینکاری میں اگر چہ مقروض تنگ دستی کی وجہ سے بروقت ادائیگی نہ کر سکے تو اسے کوئی اضافی رقم دینی نہیں پڑتی

البتہ اگر مالدار ہونے کے باوجود بروقت ادائیگی نہ کرے تو اسے تاخیر کے مطابق رقم صدقہ کرنی پڑتی ہےمگراس سے بینک کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا''

(غیرسودی بینکاری/۲۳۶)

تبصرہ: یہ بھی درحقیقت نام ہی کا فرق ہے کسی مذہب میں لزومِ التزامِ صدقہ بوقت مرابحہ واجارہ جائز نہیں۔ یہ طیب خاطر کے بغیر صرف صدقہ کے نام سےلوگوں پرڈاکہ ڈالنا اور جبراًان کے مال کو باطل طریقہ پر ہڑپ کرنا ہے نیز یہ کہنا کہ اس سے بینک کی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتامحلِ کلام ہے کیونکہ علماء نے جب بینک کومشورہ دیا تھا کہ ''یہ فنڈ بینک کی بجائے کسی ثالث کی تحویل میں رہے'' تو بینک نے اس مشورہ کوقبول نہیں کیااوراپنی ہی تحویل میں رکھنے پرمُصر رہا۔

علماء کی اس تجویز کو رد کرنا اس بات کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اس میں بینک کا نفع ضرور ہے ورنہ جمع کرنے اور پھر خیراتی کاموں میں صرف کرنے کا بوجھ ہرگز ہرگز نہ اٹھاتا ......لہٰذا یہ فرق صرف زبانی جمع خرچ ہی لگتا ہے۔

''(۵) سودی بینکوں میں ایک شخص سودی قرض لے کر جو ناجائز اورحرام کام کرنا چاہے،کرسکتا ہےسودی بینک کواس سے کوئی سروکارنہیں ہوتالیکن غیرسودی بینکاری میں مرابحہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب خریدی جانے والی چیز شرعاً حلال ہو چنانچہ ایسی چیزوں کی خریدوفروخت مرابحہ کے ذریعےممکن نہیں ہے جن کوملکیت میں لانا شرعاً حرام یاناجائز ہے،مثلاًسینما،لاٹری کےٹکٹ ،سودی اداروں کے حصص یاسودی بانڈوغیرہ

(غیرسودی بینکاری/۲۳۶)

تبصرہ: اولاً: پہلاسوال یہ ہے کہ کیامقرِض مطلق کومستقرض کے ان منکرات کی وجہ سے گناہ ہوگا؟

ثانیاً: دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا مرابحہ کو عینہ یا جعلی کارروائی کے ذریعہ نقد رقم کے وصول کا ذریعہ بنا کر پھر ان نقود کو خلاف شرع امور میں استعمال کرنا جائز ہے؟ کان اِدھر سے پکڑو یا اُدھر سے......

"(۶) سودی بینکوں میں جو قرضے جاری کیے جاتے ہیں چونکہ ان کا حقیقی اثاثوں سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اُس مصنوعی زر پیدا کرنے کا بہت بڑا سبب ہوتے ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقی مالیت نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے پوری دنیا کی معیشت ایک غبارہ کی شکل اختیار کرگئی ہے، مرابحہ میں یہ ممکن ہی نہیں ہے"۔

(غیر سودی بینکاری/ ۲۳۷)

تبصرہ: بے شک!......لیکن اس مرابحہ میں ممکن نہیں جو سود کھانے کے لئے بطور حیلہ استعمال نہ ہوتا ہو اور جس مرابحہ کو سود کھانے کے لئے بطور حیلہ کے استعمال کیا جاتا ہو اس میں اور سودی قرضوں میں سارا کا سارا بوجھ گاہک اور خریدار پر برابر پڑتا ہے۔

اگر آج کوئی اسلامی اسکالر مرابحہ سے ہٹ کر کوئی اور آسان صورت سود کھانے کی بتا دے تو یقیناً بینک فوراً لبیک کہے گا اور مرابحہ کو تُھوک پھینک دے گا...... کیونکہ اس کا مقصد تجارت اور مرابحہ و اجارہ ہے ہی نہیں بلکہ بینک بے چارہ تو بوجہ مجبوری ان مرابحات و اجارات کے حیلوں کے بکھیڑوں میں گرفتار ہے۔

الحاصل حقیقی اور اصلی مرابحہ اور سودی قرض میں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن مرابحہ بنوکیہ اور سودی قرض میں فرق بتلانا شاید کہ قبول نہ افتد۔

"(۷) سودی قرضوں میں ہر وقت یہ بات ممکن ہے کہ بینک اپنے واجب الوصول قرضے کسی دوسرے کو بیچ دے اور سودی اداروں میں قرضوں کی خرید و فروخت کا عام چلن ہے، لیکن مرابحہ میں جو رقم واجب الاداء ہوتی ہے، وہ شرعاً کسی اور کو فروخت نہیں کی

جا سکتی اور اس طرح قرضوں کی خرید و فروخت سے جو سنگین خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور جو موجودہ معاشی بحران کا بہت بڑا سبب ہیں، مرابحہ کے عقود ان سے پوری طرح محفوظ ہیں'' (غیر سودی بینکاری/ ۲۳۷)

تبصرہ: مرابحہ بلکہ اجارہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی اشیاء اور ان کی اقساط کا، بینک کے ناقص نظام کی وجہ سے دوسرے پر فروخت کرنا اور اُس کے ذمہ کی طرف منتقل کرنا عام معمول ہے بلکہ اِس کے سدّ باب کے لئے بینک کے پاس کوئی نظام اور تدبیر ہی نہیں ہے۔

''(۸) سودی بینکوں میں قرض لینے والے سرمایہ دار اپنی سہولت کے لئے بینک سے دن رات یہ معاملہ کرتے رہتے ہیں کہ قرض کی میعادیں اور قسطیں بدل کر ہمارے سود میں کمی اور اضافہ کر دو جسے Rescheduling کہا جاتا ہے۔ مرابحہ میں جو قیمت ایک مرتبہ متعین ہوگئی، وہ ہمیشہ کے لئے متعین رہتی ہے اور اس میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی......................(غیر سودی بینکاری/ ۲۳۷)

تبصرہ: مرابحہ اور اجارہ میں وہ مجبور لوگ جن کے پاس پہلے رقم نہیں تھی بعد میں آ گئی اس وجہ سے وہ اپنی قسطیں جلدی ختم کروانا چاہتے ہیں ان کو اجازت دینا چاہیے نیز اس کے جواز کی کوئی صورت بھی محنت کر کے ڈھونڈ لانا چاہیے۔

حضرت مولانا مفتی احمد ممتاز صاحب کی چند کتابیں

- اصلی چہرہ
- حیض ونفاس
- اصلی زینت
- تقویٰ کے چار انعامات
- ہویٰ پرستی کا خطرناک انجام
- آٹھ مسائل
- غیر سودی بینکاری ایک منصفانہ علمی جائزہ
- حج وعمرہ میں خواتین کے مسائلِ مخصوصہ
- درسِ ارشاد الصرف
- درسِ نحو میر
- حرام ذرائع آمدن اوران کی مروجہ صورتیں
- قربانی کے فضائل ومسائل
- انتہائی مفید دعا
- ڈاڑھی اور مونچھ مع ٹخنے کھلے رکھنے کا حکم
- امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذہانت کے دلچسپ واقعات
- ڈیجیٹل تصویر اور ٹی وی چینل کے ذریعے تبلیغ کا حکم
- مسلمان تاجر
- منفرد اور مقتدی کی نماز اور قراءت کا حکم
- اصلی زیور
- عباد الرحمٰن کے اوصاف
- مطالبہ
- پانچ مسائل
- استشارہ واستخارہ
- کپڑے موڑ کر ٹخنے کھلے رکھنے کا حکم
- اسلام کی حقیقت
- حی علی الفلاح پر قیام کا مسئلہ
- چار مسائل
- حیلہ اسقاط
- طلاقِ ثلاث
- ادعیہ نافعہ
- مروجہ تکافل اور شرعی وقف
- کرنسی، ہنڈی وحوالہ کے کاروبار کی شرعی حیثیت

ناشر تعمیرِ معاشرہ جامعہ خلفائے راشدین

مدنی کالونی، ہاکس بے روڈ گریکس، ماڑی پور کراچی 0333-2117851